اشفاق احمد

گڈریا

(اُجلے پھول)



ترتیب

گڈریا

یہ سردیوں کی ایک یخ بستہ اور طویل رات کی بات ہے۔ مَیں اپنے گرم بستر میں سر ڈھانپے گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے جھنجوڑ کر مجھے جگا دیا۔

"کون ہے؟" مَیں نے چیخ کر پوچھا۔ اور اس کے جواب میں ایک بڑا سا ہاتھ میرے سر سے ٹکرایا اور گھُپ اندھیرے سے آواز آئی۔ "تھانے والوں نے رانو کو گرفتار کر لیا۔"

"کیا؟" میں نے لرزتے ہاتھ کو پرے دھکیلنا چاہا۔ "کیا ہے؟"

اور تاریکی کا بھوت بولا۔ "تھانے والوں نے رانو کو گرفتار کر لیا — اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔"

"داؤ جی کے بچّے۔" مَیں نے رونکھے ہو کر کہا۔ "آدھی رات تنگ کرتے ہیں — دفع ہو جاؤ — مَیں نہیں آپ کے گھر میں رہتا۔ مَیں نہیں پڑھتا — داؤ جی کے بچّے — کتّے!" اور مَیں رونے لگا۔

داؤ جی نے چمکار کر کہا۔ "اگر پڑھے گا نہیں تو پاس کیسے ہو گا؟ پاس نہیں ہو گا تو بڑا آدمی نہ بن سکے گا، پھر لوگ تیرے داؤ کو کیسے جانیں گے؟"

"اللہ کرے سب مر جائیں۔ آپ بھی آپ کو جاننے والے بھی — اور مَیں بھی — مَیں بھی — مَیں بھی۔" اپنی جوانا مرگی پر مَیں ایسا رویا کہ دو ہی لمحوں میں گھگھی بندھ گئی۔

داؤ جی بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرے جاتے تھے اور کہہ رہے تھے۔ "بس اب چُپ کر۔ شاباش — میرا اچھا بیٹا۔ اس وقت یہ ترجمہ کر دے، پھر نہیں جگاؤں گا۔"

آنسوؤں کا تار ٹوٹتا جا رہا تھا۔ مَیں نے جل کر کہا۔ "آج حرامزادے رانو کو پکڑ کر لے گئے، کل کسی اور کو پکڑ لیں گے۔ آپ کا ترجمہ تو——"

"نہیں نہیں۔" انہوں نے بات کاٹ کر کہا۔ "میرا تیرا وعدہ رہا، آج کے بعد رات کو جگا کر کچھ نہ پوچھوں گا—— شاباش اب بتا۔" "تھانے والوں نے رانو کو گرفتار کر لیا۔"

مَیں نے روٹھ کر کہا۔ "مجھے نہیں آتا۔"

"فوراً نہیں کہہ دیتا ہے۔" انہوں نے سر سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "کوشش تو کر۔"

"نہیں کرتا۔" مَیں نے جل کر جواب دیا۔

اس پر وہ ذرا ہنسے اور بولے۔ "کارکنان گزمہ خانہ رانو را توقیف کردند——
کارکنان گزمہ خانہ، تھانے والے۔ بھولنا نہیں نیا لفظ ہے 'نئی ترکیب ہے، دس مرتبہ کہو۔"

مجھے پتہ تھا کہ یہ بلا ٹلنے والی نہیں ناچار گزمہ خانہ والوں کا پہاڑہ شروع کر دیا۔

جب دس مرتبہ کہہ چکا تو داؤ جی نے بڑی لجاجت سے کہا۔ "اب سارا فقرہ پانچ مرتبہ کہو۔" جب پنجگانہ مصیبت بھی ختم ہوئی تو انہوں نے مجھے آرام سے بستر میں لٹاتے ہوئے اور رضائی اوڑھاتے ہوئے کہا۔ "بھولنا نہیں! صبح اُٹھتے ہی پوچھوں گا۔"

پھر وہ جدھر سے آئے تھے، ادھر لوٹ گئے۔

شام کو جب میں ملّا جی سے سیپارے کا سبق لے کر لوٹتا تو خراسیوں والی گلی سے ہو کر اپنے گھر جایا کرتا۔ اس گلی میں طرح طرح کے لوگ بستے تھے مگر مَیں صرف موٹے ماشکی سے واقف تھا جس کو ہم سب "کدّو کریلا ڈھائی آنے" کہتے تھے۔ ماشکی کے گھر کے ساتھ بکریوں کا ایک باڑہ تھا جس کے تین طرف کچے مکانوں کی دیواریں اور سامنے کے رخ آڑی ترچھی لکڑیوں اور خاردار جھاڑیوں کا اونچا اونچا جنگلا تھا۔ اس کے بعد ایک چوکور میدان آتا، پھر لنگڑے کمہار کی کوٹھڑی اور اس کے ساتھ گیرو رنگی کھڑکیوں اور پیتل کی کیلوں والے دروازے کا ایک چھوٹا سا پکا مکان۔ اس کے بعد گلی میں ذرا سا خم پیدا ہوتا اور قدرے تنگ ہو جاتی۔ پھر جوں جوں اس کی لمبائی بڑھتی توں

توں اس کے دونوں بازو بھی ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے۔ شاید وہ ہمارے قصبے میں سب سے لمبی گلی تھی اور حد سے زیادہ سنسان! اس میں اکیلے چلتے ہوئے مجھے ہمیشہ یوں لگتا تھا جیسے میں بندوق کی نالی میں چلا جا رہا ہوں اور جونہی میں اس کے دہانے سے باہر نکلوں گا زور سے "ٹھائیں" ہو گا اور میں مر جاؤں گا مگر شام کے وقت کوئی نہ کوئی راہگیر اس گلی میں ضرور مل جاتا اور میری جان بچ جاتی۔ ان آنے جانے والوں میں کبھی کبھار ایک سفید مونچھوں والا لمبا سا آدمی بھی ہوتا جس کی شکل بارہ ماہ والے ملکھی سے بہت ملتی تھی۔ سر پر ململ کی بڑی سی پگڑی، ذرا سی خمیدہ کمر پر خاکی رنگ کا ڈھیلا اور لمبا کوٹ، کھدر کا تنگ پائجامہ اور پاؤں میں فلیٹ بُوٹ۔ اکثر اس کے ساتھ میری ہی عمر کا ایک لڑکا بھی ہوتا جس نے عین اسی طرح کے کپڑے پہنے ہوتے اور وہ آدمی سر جھکائے اور اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ اس سے باتیں کیا کرتا۔ جب وہ میرے برابر آتے تو لڑکا میری طرف دیکھتا اور میں اس کی طرف اور پھر ایک ثانیہ ٹھٹھکے بغیر گردنوں کو ذرا ذرا موڑتے ہم اپنی اپنی راہ چلے جاتے۔

ایک دن جب مَیں اور میرا بھائی ٹُھٹھیاں کے جوہڑ سے مچھلیاں پکڑنے کی ناکام کوشش کے بعد قصبہ کو واپس آ رہے تھے تو نہر کے پل پر یہی آدمی اپنی پگڑی گود میں ڈالے بیٹھا تھا اور اس کی سفید چُٹیا میلی مرغی کے پَر کی طرح اس کے سر سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے بھائی نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے کہا۔ "داؤ جی سلام۔"

اور داؤ جی نے سر ہلا کر جواب دیا۔ "جیتے رہو۔"

یہ جان کر کہ میرا بھائی اس سے واقف ہے، مَیں بے حد خوش ہوا اور تھوڑی دیر بعد اپنی منحنی آواز میں چلّایا۔ "داؤ جی سلام۔"

"جیتے رہو! جیتے رہو!!" انہوں نے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا کر کہا اور میرے بھائی نے پٹاخ سے مجھے زنّاٹے کا ایک تھپڑ دیا۔

"شیخی خورے، کتّے۔" وہ چیخا۔ "جب مَیں نے سلام کر دیا تو تیری کیا ضرورت رہ گئی تھی؟ ہر بات میں اپنی ٹانگ پھنساتا ہے کمینہ—— بھلا کون ہے وہ؟"

"داؤ جی۔" میرے بھائی نے تنگ کر پوچھا۔

"وہ جو بیٹھے ہیں، وہ داؤجی۔" مَیں نے آنسو پی کر کہا۔

"بکواس نہ کر۔" میرا بھائی چڑ گیا اور آنکھیں نکال کر بولا۔ "ہر بات میں میری نقل کرتا ہے کتا۔۔۔ شیخی خورا۔"

پھر مَیں نہیں بولا اور خاموشی کے ساتھ راہ چلتا رہا۔ دراصل مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ داؤجی سے تعارف ہو گیا۔ اس کا رنج نہ تھا کہ بھائی نے مجھے تھپڑ کیوں مارا۔ وہ تو اس کی عادت ہی تھی۔ بڑا تھا نا اس لیے ہر بات میں اپنی شیخی بگھارتا تھا۔

داؤجی سے علیک سلیک تو ہو ہی گئی تھی۔ اس لیے مَیں کوشش کر کے گلی سے اس وقت گزرنے لگا جب وہ آ جا رہے ہوں۔ انہیں سلام کر کے بڑا مزاہ آتا تھا اور جواب پا کر اس سے بھی زیادہ۔ "وہ جیتے رہو" کچھ ایسی محبّت سے کہتے کہ زندگی دو چند سی ہو جاتی اور آدمی زمین سے ذرا اوپر اُٹھ کر ہوا میں چلنے لگتا۔۔۔ سلام کا یہ سلسلہ کوئی سال بھر یونہی چلتا رہا اور اس اثناء میں مجھے اسی قدر معلوم ہو سکا کہ داؤجی گیرو رنگی کھڑکیوں والے مکان میں رہتے ہیں اور چھوٹا لڑکا ان کا بیٹا ہے۔ مَیں نے اپنے بھائی سے ان کے متعلق کچھ اور بھی پوچھنا چاہا مگر وہ بڑا سخت آدمی تھا اور میری چھوٹی سے چھوٹی بات پر چڑ جاتا تھا۔ میرے ہر سوال کے جواب میں اس کے پاس گھڑے گھڑائے دو فقرے ہوتے تھے۔ "تجھے کیا" اور "بکواس نہ کر" مگر خدا کا شکر ہے کہ میرے تجسّس کا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چلا۔ اسلامیہ پرائمری سکول سے چوتھی پاس کر کے میں ایم-بی ہائی سکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا تو داؤجی کا لڑکا میرا ہم جماعت نکلا۔ اس کی مدد سے اور اپنے بھائی کا احسان اٹھائے بغیر میں یہ جان گیا کہ داؤجی کھتری تھے اور قصبہ کی منصفی میں عرضی نویسی کا کام کرتے تھے۔ لڑکے کا نام امی چند تھا اور وہ جماعت میں سب سے ہوشیار تھا۔ اس کی پگڑی کلاس بھر میں سب سے بڑی تھی اور چہرہ بلّی کی طرح چھوٹا۔ چند لڑکے اسے میاؤں کہتے تھے اور باقی نیولا کہہ کر پکارتے تھے مگر میں داؤجی کی وجہ سے اس کو اس کے اصلی نام سے ہی پکارتا تھا۔ اس لیے وہ میرا دوست بن گیا اور ہم نے ایک دوسرے کو نشانیاں دے کر پکے یار بنے رہنے کا وعدہ کر لیا۔

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہونے میں کوئی ایک ہفتہ ہو گا جب میں امی چند کے ساتھ پہلی مرتبہ اس کے گھر گیا۔ وہ گرمیوں کی ایک جھلسا دینے والی دوپہر تھی لیکن

شیخ چلی کی کہانیاں حاصل کرنے کا شوق مجھ پر بھوت بن کر سوار تھا اور میں بھوک اور دھوپ دونوں سے بے پروا ہو کر سکول سے سیدھا اس کے ساتھ چل دیا۔ امی چند کا گھر چھوٹا سا تھا لیکن بہت ہی صاف ستھرا اور روشن پیتل کی کیلوں والے دروازے کے بعد ذرا سی ڈیوڑھی تھی۔ آگے مستطیل صحن، سامنے سرخ رنگ کا برآمدہ اور اس کے پیچھے اتنا ہی بڑا ایک کمرہ۔ صحن میں ایک طرف انار کا پیڑ۔ عقیق کے چند پودے اور دھنیا کی ایک چھوٹی سی کیاری تھی۔ دوسری طرف چوڑی سیڑھیوں کا ایک زینہ جس کی محراب تلے مختصر سی رسوئی تھی۔ گیرو رنگی کھڑکیاں ڈیوڑھی سے ملحقہ بیٹھک میں کھلتی تھیں اور بیٹھک کا دروازہ نیلے رنگ کا تھا۔ جب ہم ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو امی چند نے چلّا کر "بے بے نمستے!" کہا اور مجھے صحن کے بیچوں بیچ چھوڑ کر بیٹھک میں گھس گیا۔

برآمدے میں بوریا بچھائے بے بے مشین چلا رہی تھیں اور اس کے پاس ہی ایک لڑکی بڑی سی قینچی سے کپڑے قطع کر رہی تھی۔ بے بے نے منہ ہی منہ میں کچھ جواب دیا اور ویسے ہی مشین چلاتی رہی۔ لڑکی نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور گردن موڑ کر کہا۔ "بے بے شاید ڈاکٹر صاحب کا لڑکا ہے۔"

مشین رُک گئی۔

"ہاں ہاں۔" بے بے نے مسکرا کر کہا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ مَیں اپنے جزدان کی رسّی مروڑتا اور ٹیڑھے ٹیڑھے پاؤں دھرتا برآمدے کے ستون کے ساتھ آ لگا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" بے بے نے چمکار کر پوچھا اور میں نے نگاہیں جھکا کر آہستہ سے اپنا نام بتایا۔

"آفتاب سے بہت شکل ملتی ہے۔" اس لڑکی نے قینچی زمین پر رکھ کر کہا۔

"ہے نا بے بے؟"

"کیوں نہیں بھائی جو ہوا۔"

"آفتاب کیا؟" اندر سے آواز آئی۔ "آفتاب کیا بیٹا؟"

"آفتاب کا بھائی ہے داؤجی۔" لڑکی نے رکتے ہوئے کہا۔ "امّی چند کے ساتھ آیا ہے۔"

اندر سے داؤجی برآمد ہوئے۔ انہوں نے گھٹنوں تک اپنا پائجامہ چڑھا رکھا اور کُرتا اُتارا ہوا تھا مگر سر پر پگڑی بدستور تھی۔ پانی کی ایک ہلکی سی بالٹی اٹھائے وہ برآمدے میں آگئے اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔ "ہاں بہت شکل ملتی ہے اور یہ گولو مولو سا ہے۔" پھر بالٹی فرش پر رکھ کر انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور پاس ہی کاٹھ کا ایک سٹول کھینچ کر اس پر بیٹھ گئے۔ زمین سے پاؤں اوپر اٹھا کر انہوں نے آہستہ سے انہیں جھاڑا اور پھر بالٹی میں ڈال دیئے۔

"آفتاب کا خط آتا ہے؟" انہوں نے بالٹی سے پانی کے چلّو بھر بھر کر ٹانگوں پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"آتا ہے جی۔" میں نے ہولے سے کہا۔ "پرسوں آیا تھا۔"

"کیا لکھتا ہے؟"

"پتہ نہیں جی، ابّاجی کو پتہ ہے۔"

"اچھا۔" انہوں نے سر ہلا کر کہا۔ "تو اباجی سے پوچھا کرنا!___ جو پوچھتا نہیں اُسے کسی بھی بات کا علم نہیں ہوتا۔"

مَیں چُپ رہا۔

تھوڑی دیر انہوں نے ویسے ہی چلّو ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "کون سا سیپارہ پڑھ رہے ہو؟"

"چوتھا۔" مَیں نے وثوق سے جواب دیا۔

"کیا نام ہے تیسرے سیپارے کا؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی پتہ نہیں۔" میری آواز پھر ڈوب گئی۔

"تلک الرسل" انہوں نے پانی سے ہاتھ باہر نکال کر کہا۔ پھر تھوڑی دیر وہ ہاتھ جھٹکتے اور ہوا میں لہراتے رہے۔ بے بے مشین چلاتی رہی، وہ لڑکی نعمت خانے سے روٹی نکال کر برآمدے کی چوکی پر لگانے لگی اور مَیں جزدان کی ڈوری کھولتا لپیٹتا رہا۔ امی چند ابھی تک بیٹھک کے اندر ہی تھا اور مَیں ستون کے ساتھ ساتھ جھینپ کی عمیق گہرائیوں میں اُترتا جا رہا تھا۔ معاً داؤجی نے نگاہیں میری طرف پھیر کر کہا۔ "سورۂ فاتحہ سناؤ۔"

"مجھے نہیں آتی جی۔" مَیں نے شرمندہ ہو کر کہا۔

انہوں نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ "الحمد للہ بھی نہیں جانتے؟"

"الحمد للہ تو جانتا ہوں جی۔" میں نے جلدی سے کہا۔

وہ ذرا مسکرائے اور گویا اپنے آپ سے کہنے لگے۔ "ایک ہی بات ہے! ایک ہی بات ہے!!" پھر انہوں نے سر کے اشارے سے کہا۔ "سناؤ۔"

جب مَیں سنانے لگا تو انہوں نے اپنا پائجامہ گھٹنوں سے نیچے کر لیا اور پگڑی کا شملہ چوڑا کر کے کندھوں پر ڈال لیا اور جب مَیں نے ولا الضالین کہا تو میرے ساتھ ہی انہوں نے بھی آمین کہا۔ مجھے خیال ہوا کہ وہ ابھی اٹھ کر مجھے کچھ انعام دیں گے کیونکہ پہلی مرتبہ جب میں نے اپنے تایا جی کو الحمد للہ سنائی تھی تو انہوں نے بھی ایسے ہی آمین کیا تھا اور ساتھ ہی ایک روپیہ مجھے انعام بھی دیا تھا مگر داؤجی اسی طرح رہے بلکہ اور بھی پتھر ہو گئے۔ اتنے میں امی چند کتاب تلاش کر کے لے آیا اور جب میں چلنے لگا تو میں نے عادت کے خلاف آہستہ سے کہا۔ "داؤجی سلام۔" اور انہوں نے ویسے ہی ڈوبے ڈوبے ہولے سے جواب دیا۔ "جیتے رہو۔" بے بے نے مشین روک کر کہا۔ "کبھی کبھی امی چند کے ساتھ کھیلنے آجایا کر___"

"ہاں ہاں آجایا کر۔" داؤجی چونک کر بولے۔ "آفتاب بھی آیا کرتا تھا۔" پھر انہوں نے بالٹی پر جھکتے ہوئے کہا۔ "ہمارا آفتاب تو ہم سے بہت دور ہو گیا۔" اور فارسی کا شعر پڑھنے لگے۔

یہ داؤجی سے میری باقاعدہ پہلی ملاقات تھی اور اس ملاقات سے میں یہ نتائج اخذ کر کے چلا کہ داؤجی بڑے کنجوس ہیں۔ حد سے زیادہ چُپ سے ہیں اور کچھ بہرے سے ہیں۔ اسی دن شام کو مَیں نے اپنی اماں کو بتایا کہ میں داؤجی کے گھر گیا تھا اور وہ آفتاب بھائی کو بہت یاد کر رہے تھے۔

اماں نے قدرے تلخی سے کہا۔ "تو مجھ سے پوچھ تو لیتا۔ بے شک آفتاب ان سے پڑھتا رہا ہے اور ان کی بہت عزت کرتا ہے مگر تیرے اباجی ان سے بولتے نہیں ہیں۔ کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا، سو اب تک ناراضگی چلی آتی ہے۔ اگر انہیں پتہ چل

گیا کہ تو ان کے ہاں گیا تھا، وہ خفا ہوں گے۔" پھر اماں نے ذرا ہمدرد بن کر کہا۔ "اپنے
ابا سے اس کا ذکر نہ کرنا۔"

مَیں اباجی سے بھلا اس کا ذکر کیوں کرتا مگر سچی بات تو یہ ہے کہ مَیں داؤجی
کے ہاں جاتا رہا اور خوب خوب ان سے معتبری کی باتیں کرتا رہا۔ وہ چٹائی بچھائے کوئی
کتاب پڑھ رہے ہوتے۔ مَیں آہستہ سے ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو جاتا اور وہ کتاب بند
کر کے کہتے۔ "گولو آگیا۔" پھر میری طرف مڑتے اور ہنس کر کہتے۔ "کوئی گپ سُنا۔"
اور میں اپنی بساط اور سمجھ کے مطابق ڈھونڈ ڈھونڈ کے کوئی بات سناتا تو وہ خوب ہنستے۔
بس یونہی میرے لئے ہنستے حالانکہ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ کچھ دلچسپ باتیں بھی
نہ ہوتی تھیں۔ پھر وہ اپنے رجسٹر سے کوئی کاغذ نکال کر کہتے، لے ایک سوال نکال۔ اس
بات سے میری جان جاتی تھی لیکن ان کا وعدہ بڑا رسیلا ہوتا کہ ایک سوال اور پندرہ منٹ
باتیں۔ اس کے بعد ایک اور سوال اور پھر پندرہ منٹ باتیں۔ چنانچہ میں مان جاتا اور
کاغذ لے کر بیٹھ جاتا لیکن ان کے خود ساختہ سوال کچھ ایسے الجھے ہوتے کہ اگلی باتوں اور
اگلے سوالوں کا وقت بھی نکل جاتا۔ اگر خوش قسمتی سے سوال جلد حل ہو جاتا تو وہ چٹائی
کو ہاتھ لگا کر پوچھتے۔ "یہ کیا ہے؟" "چٹائی۔" مَیں منہ پھاڑ کر جواب دیتا۔ "اوں
ہوں۔" وہ سر ہلا کر کہتے۔ "فارسی میں بتاؤ۔" تو میں تنک کر جواب دیتا۔ "لو جی ہمیں
کوئی فارسی پڑھائی جاتی ہے۔" اس پر وہ چمکار کر کہتے۔ "مَیں پڑھاتا ہوں گولو، مَیں جو
سکھاتا ہوں ــــ سنو! فارسی میں بوریا، عربی میں حصیر۔" میں شرارت سے ہاتھ جوڑ کر
کہتا۔ "بخشو جی بخشو، فارسی بھی اور عربی بھی۔ میں نہیں پڑھتا جی معاف کرو۔" مگر وہ
سُنی ان سُنی ایک کر کے کہے جاتے۔ "فارسی بوریا عربی حصیر۔" اور پھر کوئی چاہے اپنے
کانوں میں سیسہ بھر لیتا داؤجی کے الفاظ گھستے چلے جاتے ــــ امی چند کتابوں کا کیڑا تھا۔
سارا دن بیٹھک میں بیٹھا لکھتا پڑھتا رہتا۔ داؤجی اس کے اوقات میں مخل نہ ہوتے تھے
لیکن ان کے داؤ امی چند پر بھی برابر ہوتے رہتے۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر گھڑے
سے پانی پینے آیا، داؤجی نے کتاب سے نگاہیں اٹھا کر پوچھا۔ "بیٹا ڈُو کا ناؤن کیا ہے؟"
اس نے گلاس منہ کے ساتھ لگائے لگائے "ڈیڈ" کہا اور پھر گلاس گھڑونچی
تلے پھینک کر اپنے کمرے میں آگیا۔ داؤجی پھر پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ گھر میں ان

کو اپنی بیٹی سے بڑا پیار تھا۔ ہم سب اسے بی بی کہہ کر پکارتے تھے۔ اکیلے داؤجی نے اس کا
نام قرۃ رکھا ہوا تھا۔ اکثر بیٹھے بیٹھے ہانک لگا کر کہتے۔ "قرۃ بیٹا یہ قینچی تجھ سے کب
چھوٹے گی؟" اور وہ اس کے جواب میں مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔ بے بے کو اس نام سے
بڑی چڑ تھی۔ وہ چیخ کر جواب دیتی "تو نے اس کا نام قرۃ رکھ کر اس کے بھاگ میں
کُرتے سینے لکھوا دیئے ہیں۔ منہ اچھا نہ ہو تو شبد تو اچھے نکالنے چاہئیں۔" اور داؤجی
ایک لمبی سانس لے کر کہتے۔ "جاہل اس کا مطلب کیا جانیں۔" اس پر بے بے کا غصہ
چمک اٹھتا اور اس کے منہ میں جو آتا، کہتی چلی جاتی۔ پہلے کوسنے، پھر بددعائیں اور آخر
میں گالیوں پر اتر آتی۔ بی بی روکتی تو داؤجی کہتے۔ "ہوائیں چلنے کو ہوتی ہیں بیٹا اور گالیاں
برسنے کو۔ تم انہیں روکو مت، انہیں ٹوکو مت۔" پھر وہ اپنی کتابیں سمیٹتے اور اپنا محبوب
حصیر اٹھا کر چپکے سے سیڑھیاں چڑھ جاتے۔

نویں جماعت کے شروع ہی سے مجھے ایک بُری عادت پڑ گئی اور اس بُری
عادت نے عجیب گُل کھلائے۔ حکیم علی احمد مرحوم ہمارے قصبہ کے ایک ہی حکیم تھے۔
علاج معالجے سے تو ان کو کچھ ایسی دلچسپی نہ تھی لیکن باتیں بڑی مزیدار سناتے تھے۔
اولیاؤں کے تذکرے، جنوں بُھوتوں کی کہانیاں اور حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کی گھریلو
زندگی کی داستانیں ان کے تیر بہدف ٹوٹکے تھے۔ ان کے تنگ و تاریک مطب میں
معجون کے چند ڈبوں، شربت کی دس پندرہ بوتلوں اور دو آتشی شیشیوں کے سوا اور کچھ نہ
تھا۔ دواؤں کے علاوہ وہ اپنی طلسماتی تقریر اور حضرت سلیمانؑ کے خاص صدری
تعویزوں سے مریض کا علاج کیا کرتے۔ انہی باتوں کے لیے دور دراز گاؤں کے مریض
ان کے پاس کھچے چلے آتے اور فیض یاب ہو کر جاتے۔ ہفتہ دو ہفتہ کی صحبت میں میرا ان
کے ساتھ ایک معاہدہ ہو گیا۔ میں اپنے ہسپتال سے ان کے لیے خالی بوتلیں اور شیشیاں
چُرا کر لاتا اور اس کے بدلے میں وہ مجھے داستان امیر حمزہ کی جلدیں پڑھنے کے لیے دیا
کرتے۔ یہ کتابیں کچھ ایسی دلچسپ تھیں کہ میں رات رات بھر اپنے بستر میں دبک کر
انہیں پڑھا کرتا اور صبح دیر تک سویا رہتا۔ اماں میرے اس رویہ سے سخت نالاں تھیں۔
اباجی کو میری صحت برباد ہونے کا خطرہ لاحق تھا لیکن میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ چاہے

جان چلی جائے، اب کے دسویں میں وظیفہ ضرور حاصل کروں گا۔ رات طلسم ہوشربا کے ایوانوں میں بسر ہوتی اور دن کلاس میں بنچ پر کھڑے ہو کر۔ سہ ماہی امتحان میں فیل ہوتے ہوتے بچا۔ ششماہی میں بیمار پڑ گیا اور سالانہ امتحان کے موقع پر حکیم جی کی مدد سے ماسٹروں سے مل ملا کر پاس ہو گیا۔ دسویں میں صندلی نامہ، فسانہ آزاد اور الف لیلہ ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ فسانہ آزاد اور صندلی نامہ گھر پر رکھے تھے لیکن الف لیلہ سکول کے ڈیسک میں بند رہتی۔ آخری بنچ پر میں جغرافیہ کی کتاب تلے سند باد جہازی کے ساتھ ساتھ چلتا اور اس طرح دنیا کی سیر کرتا۔

بائیس مئی کا واقعہ ہے کہ صبح دس بجے یونیورسٹی سے نتیجہ کی کتاب ایم۔بی ہائی سکول پہنچی۔ امی چند نہ صرف سکول میں بلکہ ضلع بھر میں اوّل آیا تھا۔ چھ لڑکے فیل تھے اور بائیس پاس۔ حکیم جی کا جادو یونیورسٹی پر نہ چل سکا اور پنجاب کی جابر دانش گاہ نے میرا نام بھی ان چھ لڑکوں میں شامل کر دیا۔ اسی شام قبلہ گاہی نے بید سے میری پٹائی کی اور گھر سے باہر نکال دیا۔ میں ہسپتال کے رہٹ کی گدی پر آ بیٹھا اور رات گئے تک سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیے اور کدھر جانا چاہیے۔ خدا کا ملک تنگ نہیں تھا اور میں عمرو عیار کے ہتھکنڈوں اور سند باد جہازی کے تمام طریقوں سے واقف تھا مگر پھر بھی کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔ کوئی دو تین گھنٹے مسلسل اسی طرح ساکت و جامد اس گدی پر بیٹھا زیست کرنے کی راہیں سوچتا رہا۔ اتنے میں اماں سفید چادر اوڑھے مجھے ڈھونڈتی ادھر آ گئیں اور اباجی سے معافی لے دینے کا وعدہ کر کے مجھے پھر گھر لے گئیں۔ مجھے معافی وافی سے کوئی دلچسپی نہ تھی، مجھے تو بس ایک رات اور ان کے یہاں گزارنی تھی اور صبح سویرے اپنے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ چنانچہ میں آرام سے ان کے ساتھ جا کر حسب معمول اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔

اگلے دن میرے فیل ہونے والے ساتھیوں میں سے خوشیا، کوڈو اور ویسو یب یب مسجد کے پچھواڑے ٹال کے پاس بیٹھے مل گئے۔ وہ لاہور جا کر بزنس کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ ویسو یب نے مجھے بتایا کہ لاہور میں بہت بزنس ہے کیونکہ اس کے بھایا جی اکثر اپنے دوست فتح چند کے ٹھیکوں کا ذکر کیا کرتے تھے جس نے سال کے اندر اندر دو کاریں خرید لی تھیں۔ مَیں نے ان سے بزنس کی نوعیت کے بارے میں پوچھا تو یب یب

نے کہا کہ لاہور میں ہر طرح کا بزنس مل جاتا ہے۔ بس ایک دفتر ہونا چاہیے اور اس کے سامنے بڑا سائن بورڈ۔ سائن بورڈ کو دیکھ کر لوگ خود ہی بزنس دے جاتے ہیں۔ اس وقت بزنس سے مراد وہ کرنسی کے نوٹ لے رہا تھا! مَیں نے ایک مرتبہ وضاحت چاہی تو کوڈو چہک کر بولا۔ ”یار دیسو سب کچھ جانتا ہے۔ یہ بتا تو تیار ہے یا نہیں؟“

پھر اس نے پلٹ کر دیسو سے پوچھا۔ ”انارکلی میں دفتر بنائیں گے نا؟“

دیسو نے ذرا سوچ کر کہا۔ ”انارکلی میں یا شاہ عالمی کے باہر دونوں ہی جگہیں ایک سی ہیں۔“

میں نے کہا ”انارکلی زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہی زیادہ مشہور جگہ ہے اور اخباروں میں جتنے بھی اشتہار نکلتے ہیں، ان میں انارکلی لاہور لکھا ہوتا ہے۔“

چنانچہ یہ طے پایا کہ اگلے دن دو بجے کی گاڑی سے ہم لاہور روانہ ہو جائیں گے۔

گھر پہنچ کر مَیں سفر کی تیاری کرنے لگا۔ بُوٹ پالش کر رہا تھا کہ نوکر نے آ کر شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”چلو جی ڈاکٹر صاحب بلاتے ہیں۔“

”کہاں ہیں؟“ مَیں نے برش زمین پر رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا۔

”ہسپتال میں۔“ وہ بدستور مسکرا رہا تھا کیونکہ میری پٹائی کے روز حاضرین میں وہ بھی شامل تھا۔

میں ڈرتے ڈرتے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھا۔ پھر آہستہ سے جالی والا دروازہ کھول کر اباجی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ان کے علاوہ داؤجی بھی بیٹھے تھے۔ مَیں نے سہمے سہمے داؤجی کو سلام کیا اور اس کے جواب میں بڑی دیر کے بعد جیتے رہو کی مانوس دعا سُنی۔

”ان کو پہچانتے ہو؟“ اباجی نے سختی سے پوچھا۔

”بے شک!“ مَیں نے ایک مہذب سیلزمین کی طرح کہا۔

”بے شک کے بچّے، حرامزادے، مَیں تیری یہ سب——“

”نہ نہ ڈاکٹر صاحب۔“ داؤجی نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔ ”یہ تو بہت ہی اچھا بچّہ ہے۔ اس کو تو——“

اور ڈاکٹر صاحب نے بات کاٹ کر تلخی سے کہا۔ "آپ نہیں جانتے منشی جی اس کمینے نے میری عزت خاک میں ملادی۔"

"آپ فکر نہ کریں۔" داؤجی نے سر جھکائے ہوئے کہا۔ "یہ ہمارے آفتاب سے بھی ذہین ہے اور ایک دن——"

اب کے ڈاکٹر صاحب کو غصہ آگیا اور انہوں نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔ "کیسی بات کرتے ہو منشی جی! یہ آفتاب کے جوتے کی برابری نہیں کر سکتا۔"

"کرلے گا، کرلے گا——ڈاکٹر صاحب۔" داؤجی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ خاطر جمع رکھیں۔"

پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "میں سیر کو چلتا ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ آؤ، راستے میں باتیں کریں گے۔"

اباجی اسی طرح کرسی پر بیٹھے غصے کے عالم میں اپنار جسٹر اُلٹ پلٹ کرتے اور بڑبڑاتے رہے۔ میں نے آہستہ آہستہ چل کر جالی والا دروازہ کھولا تو داؤجی نے پیچھے مڑ کر کہا۔ "ڈاکٹر صاحب بھول نہ جائیے گا، ابھی بھجوا دیجئے گا۔"

اباجی نے ویسے ہی چیزیں پٹختے "اچھا" کہا اور داؤجی خدا حافظ کہہ کر میرے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل آئے۔

داؤجی مجھے اِدھر اُدھر گھماتے اور مختلف درختوں کے نام فارسی میں بتاتے نہر کے اسی پل پر لے گئے جہاں پہلے پہل میرا ان سے تعارف ہوا تھا۔ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ کر انہوں نے پگڑی اتار کر گود میں ڈال لی، سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور کہا۔ "آج سے میں تمہیں پڑھاؤں گا اور اگر جماعت میں اوّل نہ لا سکا تو فرسٹ ڈویژن ضرور دلوا دوں گا۔ میرے ہر ارادے میں خداوند تعالیٰ کی مدد شامل ہوتی ہے اور اس ہستی نے مجھے اپنی رحمت سے کبھی مایوس نہیں کیا——"

"مجھ سے پڑھائی نہ ہوگی۔" میں نے گستاخی سے بات کاٹی۔

"تو اور کیا ہوگا گولو؟" انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے کہا "میں بزنس کروں گا، روپیہ کماؤں گا اور اپنی کار لے کر یہاں

آؤں گا۔ پھر دیکھنا——"

اب کے داؤجی نے میری بات کاٹی اور بڑی محبت سے کہا۔ "خدا ایک چھوڑ تجھے دس کاریں دے لیکن ایک اَن پڑھ کی کار میں نہ میں بیٹھوں گا۔ نہ ڈاکٹر صاحب۔"

مَیں نے جل کر کہا۔ "مجھے کسی کی پروا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے گھر راضی رہیں، مَیں اپنے یہاں خوش۔"

انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "میری بھی پروا نہیں؟" میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ دکھی سے ہو گئے اور بار بار پوچھنے لگے۔ "میری بھی پروا نہیں؟ او گولو میری بھی پروا نہیں؟"

مجھے ان کے لہجہ پر ترس آنے لگا اور میں نے آہستہ سے کہا۔ "آپ کی تو ہے مگر——" مگر انہوں نے میری بات نہ سنی اور کہنے لگے۔ "اگر اپنے حضرت کے سامنے میرے منہ سے ایسی بات نکل جاتی 'اگر مَیں یہ کفر کا کلمہ کہہ جاتا—— تو—— تو——"

انہوں نے فوراً پگڑی اٹھا کر سر پر رکھ لی اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے۔ "میں حضور کے دربار کا ایک ادنیٰ کتا۔ میں حضرت مولانا کی خاک سے بدتر۔ بندہ ہو کر آقا سے یہ کہتا لعنت کا طوق نہ پہنتا۔" پھر انہوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے اور سر بالکل گود میں جھکا کر بولے۔ "مَیں ذات کا گڈریا۔ میرا باپ منڈاسی کا گوالا۔ میں جہالت کا فرزند۔ میرا خاندان ابوجہل کا خانوادہ اور آقا کی ایک نظرِ کرم، حضرت کا ایک اشارہ۔ حضور نے چنتو کو منشی چنت رام بنا دیا۔ لوگ کہتے ہیں منشی جی، میں کہتا ہوں رحمتہ اللہ علیہ کا کفش بردار——لوگ سمجھتے ہیں——" داؤجی کبھی ہاتھ جوڑتے، کبھی سر جھکاتے۔ کبھی انگلیاں چوم کر آنکھوں کو لگاتے اور بیچ بیچ میں فارسی کے شعر پڑھتے جاتے۔ میں کچھ پریشان سا پشیمان سا ان کا زانو چھو کر آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ داؤجی! داؤجی؟ اور داؤجی!" میرے آقا، حضرت مولانا میرے مرشد" کا وظیفہ کیے جاتے۔ جب جذب کا یہ عالم دور ہوا تو نگاہیں اوپر اٹھا کر بولے۔ "کیا اچھا موسم ہے۔ دن بھر گرمی پڑتی ہے تو خوشگوار شاموں کا نزول ہوتا ہے۔" پھر وہ پُل کی دیوار سے اٹھے اور بولے۔ "چلو اب چلیں بازار سے تھوڑا سا سودا خریدنا ہے۔" مَیں جیسا سرکش و بدمزاج بن کر ان کے ساتھ آیا تھا، اس سے کہیں زیادہ منفعل اور خجل ان کے ساتھ لوٹا۔ کھمے پنساری یعنی دیسو یب کے

باپ کی دکان سے انہوں نے گھریلو ضروریات کی چند چیزیں خریدیں اور لفافے گود میں اٹھا کر چل دیئے۔ میں بار بار ان سے لفافے لینے کی کوشش کرتا مگر ہمت نہ پڑتی۔ ایک عجیب سی شرم ایک انوکھی سی ہچکچاہٹ مانع تھی اور اسی تامل اور جھجک میں ڈوبتا ابھرتا میں ان کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر یہ بھید کھلا کہ اب میں انہی کے ہاں سویا کروں گا اور وہیں پڑھا کروں گا کیونکہ میرا بستر مجھ سے بھی پہلے وہاں پہنچا ہوا تھا اور اس کے پاس ہی ہمارے یہاں سے بھیجی ہوئی ایک ہری کین لالٹین بھی رکھی تھی۔

بزنس مین بننا اور پاں پاں کرتی پیکارڈ اڑائے پھرنا میرے مقدر میں نہ تھا۔ گو میرے ساتھیوں کی روانگی کے تیسرے ہی روز بعد ان کے والدین بھی انہیں لاہور سے پکڑ لائے لیکن اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو شاید اس وقت انار کلی میں ہمارا دفتر پتہ نہیں ترقی کے کون سے شاندار سال میں داخل ہو چکا ہوتا!

داؤجی نے میری زندگی اجیرن کر دی۔ مجھے تباہ کر دیا، مجھ پر جینا حرام کر دیا۔ سارا دن سکول کی بکواس میں گزرتا اور رات، گرمیوں کی مختصر سی رات، ان کے سوالات کا جواب دینے میں۔ کوٹھے پر ان کی کھاٹ میرے بستر کے ساتھ لگی ہے اور مونگ رسول اور مرالہ کی نہروں کی بابت پوچھ رہے ہیں۔ مَیں نے ٹھیک بتا دیا ہے۔ وہ پھر اسی سوال کو دہرا رہے ہیں۔ میں نے پھر ٹھیک بتا دیا ہے اور انہوں نے پھر انہی نہروں کو آگے لا کھڑا کیا ہے۔ میں جاتا اور جھڑک کر کہتا۔ ''مجھے پتہ نہیں، میں نہیں بتاتا۔'' تو وہ خاموش ہو جاتے اور دم سادھ لیتے۔ میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتا تو وہ شرمندگی کنکر بن کر پتلیوں میں اترتی جاتی۔ میں آہستہ سے کہتا۔ ''داؤجی۔''

''ہوں!'' ایک گھمبیر سی آواز آتی۔

''داؤجی کچھ اور پوچھو۔''

داؤجی نے کہا۔ ''بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے ــــ اس کی ترکیب نحوی کرو۔''

میں نے سعادت مندی کے ساتھ کہا۔ ''جی یہ تو بہت لمبا فقرہ ہے۔ صبح لکھ کر بتا دوں گا، کوئی اور پوچھیئے۔''

انہوں نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائے کہا۔ ''میرا گولو بہت اچھا ہے۔''

میں نے ذرا سوچ کر کہنا شروع کیا۔ ''بہت اچھا صفت ہے حرفِ ربط مل کر بنا مسند ــــ''

اور داؤجی اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ہاتھ اٹھا کر بولے۔ ''جانِ پدر کیوں تجھے پہلے بھی کہا ہے مسند الیہ پہلے بتایا کر۔''

میں نے ترکیبِ نحوی سے جان چھڑانے کے لیے پوچھا۔ ''آپ مجھے جانِ پدر کیوں کہتے ہیں۔ جانِ داؤ کیوں نہیں کہتے؟''

''شاباش۔'' وہ خوش ہو کر کہنے لگے۔ ''ایسی باتیں پوچھنے کی ہوتی ہیں۔ جان لفظ فارسی کا ہے اور داؤ بھاشا کا۔ ان کے درمیان فارسی اضافت نہیں لگ سکتی۔ جو لوگ دن بدن لکھتے یا بولتے ہیں، سخت غلطی کرتے ہیں اور روز بروز کھویا دن پر دن اسی طرح ہے ــــ''

اور جب میں سوچتا کہ یہ تو ترکیبِ نحوی سے بھی خطرناک معاملے میں الجھ گیا ہوں تو جمائی لے کر پیار سے کہتے۔ ''داؤجی اب نیند آ رہی ہے!''

''اور وہ ترکیب نحوی؟'' وہ جھٹ سے پوچھتے۔

اس کے بعد میں چاہے لاکھ بہانے کرتا، اِدھر اُدھر کی ہزار باتیں کرتا مگر وہ اپنی کھاٹ پر ایسے ہی بیٹھے رہتے بلکہ اگر کوئی ذرا سی دیر ہو جاتی تو کرسی پر رکھی ہوئی پگڑی اٹھا کر سر پر دھر لیتے۔ چنانچہ کچھ بھی ہوتا، ان کے ہر سوال کا خاطر خواہ جواب دینا پڑتا۔

امی چند کالج چلا گیا تو اس کی بیٹھک مجھے مل گئی اور داؤجی کے دل میں اس کی محبت پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب مجھے داؤجی بہت اچھے لگنے لگے تھے لیکن ان کی جو باتیں مجھے اس وقت بری لگتی تھیں، وہ اب بھی بُری لگتی ہیں بلکہ اب پہلے سے کسی قدر زیادہ، شاید اس لیے کہ اب میں نفسیات کا ایک ہونہار طالب علم ہوں اور داؤجی پرانے ملائی کتب کے پروردہ تھے۔ سب سے بری عادت ان کی اٹھتے بیٹھتے سوال پوچھتے رہنے کی تھی اور دوسری کھیل کود سے منع کرنے کی۔ وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ آدمی پڑھتا رہے، پڑھتا رہے اور جب اس مدقوق کی موت کا دن قریب آئے تو کتابوں کے ڈھیر پر جان دے دے۔ صحت جسمانی قائم رکھنے کے لیے ان کے پاس بس ایک ہی نسخہ تھا۔ لمبی سیر

اور وہ بھی صبح کی۔ تقریباً روز سورج نکلنے سے کوئی دو گھنٹے پیشتر وہ مجھے بیٹھک میں جگانے آتے اور میرا کندھا ہلا کر کہتے۔ "اٹھ گولو موٹا ہو گیا بیٹا۔" دنیا جہان کے والدین صبح جگانے کے لیے یہ کہا کرتے ہیں کہ "اٹھو بیٹا، صبح ہو گئی یا سورج نکل آیا۔" مگر وہ "موٹا ہو گیا" کہہ کر میری تذلیل کیا کرتے۔ میں منمناتا تو چمکار کر کہتے۔ "بھدّا ہو جائے گا بیٹا تو گھوڑے پر ضلع کا دورہ کیسے کیا کرے گا؟"

اور مَیں گرم گرم بستر سے ہاتھ جوڑ کر کہتا۔ "داؤجی خدا کے لیے مجھے صبح نہ جگاؤ، چاہے مجھے قتل کر دو۔ مجھے جان سے مار دو۔"

یہ فقرہ ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ وہ فوراً میرے سر پر لحاف ڈال دیتے اور باہر نکل جاتے۔

بے بے کو ان داؤجی سے اللہ واسطے کا بیر تھا اور داؤجی ان سے بہت ڈرتے تھے۔ وہ سارا دن محلے والیوں کے کپڑے سیا کرتیں اور داؤجی کو کوسنے دیئے جاتیں۔ ان کی اس زبان درازی پر مجھے بہت غصہ آتا تھا مگر پانی میں رہ کر مگر مچھ سے بیر نہ ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھار وہ ناگفتنی گالیوں پر اتر آتیں تو داؤجی میرے پاس بیٹھک میں آ جاتے اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر کرسی پر بیٹھ جاتے۔ تھوڑی دیر بعد کہتے۔ "غیبت کرنا بڑا گناہ ہے۔ لیکن میرا خدا مجھے معاف کرے۔ تیری بے بے بھٹیارن ہے اور اس کی سرائے میں مَیں میری قرۃ العین اور تھوڑا تھوڑا تو بھی۔ ہم تینوں بڑے عاجز مسافر ہیں۔" اور واقعی بے بے بھٹیارن سی تھی۔ اس کا رنگ سخت کالا تھا اور دانت بے حد سفید۔ ماتھا محراب دار اور آنکھیں چنیاں سی۔ چلتی تو ایسی گربہ پائی کے ساتھ جیسے (خدا مجھے بھی معاف کرے) کتنی کنسوئیاں لیتی پھرتی ہے۔ بیچاری بی بی کو ایسی ایسی بری باتیں کہتی کہ وہ دنوں دن رو رو کر ہلکان ہُوا کرتی۔ ایک امی چند کے ساتھ اس کی بنتی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ ہم دونوں ہم شکل تھے یا شاید اس وجہ سے کہ اس کو بی بی کی طرح اپنے داؤجی سے پیار نہ تھا۔ یوں تو بی بی بچاری بہت اچھی لگتی تھی مگر اس سے میری بھی نہ بنتی تھی۔ میں کوٹھے پر بیٹھا سوال نکال رہا ہوں۔ داؤجی نیچے بیٹھے ہیں اور بی بی اوپر برساتی سے ایندھن لینے آئی تو ذرا رُک کر مجھے دیکھا، پھر منڈیر سے جھانک کر بولی۔ "داؤجی پڑھ نہیں رہا ہے، تنکوں کی چارپائیاں بنا رہا ہے۔"

مَیں غصیل بچے کی طرح منہ چڑا کر کہتا۔ "تجھے کیا، نہیں پڑھتا۔ تو کیوں بُڑ بُڑ کرتی ہے — آئی بڑی تھانیدارنی۔"

اور داؤجی نیچے سے ہانک لگا کر کہتے۔ "نہ نہ گولو مولو بہنوں سے نہیں جھگڑا کرتے۔"

اور مَیں زور سے چلّاتا۔ "پڑھ رہا ہوں جی، جھوٹ بولتی ہے۔"

داؤجی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ جاتے اور کاپیوں کے نیچے نیم پوشیدہ چارپائی دیکھ کر کہتے۔ "قرۃ بیٹا تو اس کو چڑایا نہ کر۔ یہ جن بڑی مشکل سے قابو کیا ہے۔ اگر ایک بار پھر بگڑ گیا تو مشکل سے سنبھلے گا۔"

بی بی کہتی۔ "کاپی اٹھا کر دیکھ لو داؤجی، اس کے نیچے ہے وہ چارپائی جس سے کھیل رہا تھا۔"

میں قہر آلود نگاہوں سے بی بی کو دیکھتا اور وہ لکڑیاں اٹھا کر نیچے اتر جاتی۔ پھر داؤجی سمجھاتے کہ "بی بی یہ سب کچھ تیرے فائدے کے لیے کہتی ہے ورنہ اسے کیا پڑی ہے کہ مجھے بتاتی پھرے۔ تو فیل ہو یا پاس، اس کی بلا سے! مگر وہ تیری بھلائی چاہتی ہے۔ تیری بہتری چاہتی ہے۔" اور مجھے داؤجی کی یہ بات ہرگز سمجھ نہ آتی تھی۔ میری شکایتیں کرنے والی میری بھلائی کیونکر چاہ سکتی تھی؟

ان دنوں معمول یہ تھا کہ صبح دس بجے سے پہلے داؤجی کے ہاں سے چل دیتا، گھر جا کر ناشتہ کرتا اور پھر سکول پہنچ جاتا۔ آدھی چھٹی پر میرا کھانا سکول بھیج دیا جاتا اور شام کو سکول بند ہونے پر گھر آ کر اپنی لالٹین تیل سے بھرتا اور داؤجی کے یہاں آ جاتا۔ پھر رات کا کھانا بھی مجھے داؤجی کے گھر پر ہی بھجوا دیا جاتا۔ جن ایام میں منصفی بند ہوتی، داؤجی سکول کی گراؤنڈ میں آ کر بیٹھ جاتے اور میرا انتظار کرنے لگتے۔ وہاں سے گھر تک سوالات کی بوچھاڑ رہتی۔ سکول میں جو کچھ پڑھا گیا ہوتا، اس کی تفصیل پوچھتے۔ پھر مجھے میرے گھر تک چھوڑ کر خود سیر کو چلے جاتے۔ ہمارے قصبہ میں منصفی کا کام مہینے میں دس دن داؤجی باقاعدہ کچہری میں گزارتے تھے۔ ایک آدھ عرضی آ جاتی تھی تو دو چار روپے کما لیتے ورنہ فارغ اوقات میں وہاں بھی مطالعہ کا سلسلہ جاری رکھتے۔ بے بے کا کام اچھا تھا، اس کی کتر بیونت اور محلے والیوں سے جوڑ توڑ اچھے مالی نتائج پیدا کرتی تھی۔

چونکہ چند سالوں سے گھر کا بیشتر خرچ اس کی سلائی سے چلتا تھا، اس لیے وہ داؤجی پر اور بھی حاوی ہو گئی تھی —— ایک دن خلاف معمول داؤجی کو لینے میں منصفی چلا گیا۔ اس وقت کچہری بند ہو گئی تھی اور داؤجی نانبائی کے چھپر تلے ایک بنچ پر بیٹھے گُڑ کی چائے پی رہے تھے۔ مَیں نے ہولے سے جا کر ان کا بستہ اٹھا لیا اور ان کے گلے میں مَیں نے بانہیں ڈال کر کہا۔ "چلیئے آج میں آپ کو لینے آیا ہوں۔" انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر چائے کے بڑے بڑے گھونٹ بھرے۔ ایک آنہ جیب سے نکال کر نانبائی کے حوالے کیا اور چپ چاپ میرے ساتھ چل دیئے۔ میں نے شرارت سے ناچ کر کہا۔ "گھر چلیئے۔ بے بے کو بتاؤں گا کہ آپ چوری چوری یہاں چائے پیتے ہیں۔"

داؤجی جیسے شرمندگی ٹالنے کو مسکرائے اور بولے "اس کی چائے بہت اچھی ہوتی ہے اور گُڑ کی چائے سے تھکن بھی دور ہو جاتی ہے۔ پھر یہ ایک آنہ میں گلاس بھر کے دیتا ہے۔ تم اپنی بے بے سے نہ کہنا خواہ مخواہ ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔ زیادتی پر اُتر آئے گی۔" پھر انہوں نے کچھ خوفزدہ ہو کر، کچھ مایوس ہو کر کہا۔ "اس کی تو فطرت ہی ایسی ہے۔" اس دن مجھے داؤجی پر بڑا رحم آیا۔ میرا جی ان کے لیے بہت کچھ کرنے کو چاہنے لگا مگر اس وقت میں نے بے بے سے نہ کہنے کا وعدہ کر کے ہی ان کے لیے بہت کچھ کیا۔ جب اس واقعہ کا ذکر میں نے اماں سے کیا تو وہ کبھی میرے ہاتھ اور کبھی نوکر کی معرفت داؤجی کے ہاں دودھ، پھل اور چینی وغیرہ بھیجنے لگیں مگر اس رسد سے داؤجی کو کبھی بھی کچھ نصیب نہ ہوا۔ ہاں بے بے کی نگاہوں میں میری قدر بڑھ گئی اور اس نے کسی حد تک مجھ سے رعایتی برتاؤ کرنا شروع کر دیا۔

مجھے یاد ہے ایک صبح میں دودھ سے بھرا تاملوٹ ان کے یہاں لے کر آیا تھا اور بے بے گھر پر نہ تھی، وہ اپنی سکھیوں کے ساتھ بابا ساون کے جوہڑ میں اشنان کرنے گئی تھی اور گھر میں صرف داؤجی اور بی بی تھے۔ دودھ دیکھ کر داؤجی نے کہا۔ "چلو آج چائے پئیں۔ میں دکان سے گُڑ لے کر آتا ہوں۔ تم پانی چولہے پر رکھو۔" بی بی نے جلدی جلدی چولہا سلگایا۔ میں پتیلی میں پانی ڈال کر لایا اور پھر ہم دونوں وہیں چوکے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ داؤجی گُڑ لے کر آ گئے تو انہوں نے کہا۔ "تم دونوں اپنے اپنے کام پر بیٹھو، چائے میں بناتا ہوں۔" چنانچہ بی بی مشین چلانے لگی اور میں ڈائریکٹ

ان ڈائریکٹ کی مشقیں لکھنے لگا۔ داؤجی چولہا بھی جھونکے جاتے تھے اور عادت کے مطابق مجھے بھی اونچے اونچے بتاتے جاتے تھے۔ "گلیو نے کہا۔ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ گلیو نے دریافت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ یہ نہ لکھ دینا کہ سورج کے گرد گھومتی تھی۔" پانی اُبل رہا تھا۔ داؤجی خوش ہو رہے تھے۔ اسی خوشی میں جھوم جھوم کر وہ اپنا تازہ بنایا ہوا گیت گا رہے تھے۔ "او گولو! او گولو!! گلیلو کی بات مت بھولنا، گلیلو کی بات مت بھولنا۔" انہوں نے چائے کی پتی کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دی۔ برتن ابھی تک چولہے پر ہی تھا اور داؤجی ایک چھوٹے سے بچے کی طرح پانی کی گُل بُل گُل بُل کے ساتھ گولو گلیلو کیے جا رہے تھے۔ میں ہنس رہا تھا اور اپنا کام کیے جا رہا تھا۔ بی بی مسکرا رہی تھی اور مشین چلائے جاتی تھی اور ہم تینوں اپنے چھوٹے سے گھر میں بڑے ہی خوش تھے، گویا سارے محلے بلکہ سارے قصبہ کی خوشیاں بڑے بڑے رنگین پروں والی پریوں کی طرح ہمارے گھر میں اتر آئی ہوں۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور بے بے اندر داخل ہوئی۔ داؤجی نے دروازہ کھلنے کی آواز پر پیچھے مڑ کر دیکھا اور ان کا رنگ فق ہو گیا۔ چمکتی ہوئی پتیلی سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس کے اندر چائے کے چھوٹے چھوٹے چھلاوے ایک دوسرے کے پیچھے شور مچاتے پھرتے تھے اور ممنوعہ کھیل رچانے والا بڈھا موقع پر پکڑا گیا تھا۔ بے بے نے آگے بڑھ کر چولہے کی طرف دیکھا اور داؤجی نے چوکھٹے سے اٹھتے ہوئے معذرت بھرے لہجہ میں کہا۔ "چائے ہے!"

بے بے نے ایک دوہتڑ داؤجی کی کمر میں مارا اور کہا۔ "بڈھے بردھا تجھے لاج نہیں آتی۔ تجھ پر بہار دو بھرے تجھے بم سمیٹے یہ تیرے چائے پینے کے دن ہیں۔ میں بیوہ گھر میں نہ تھی تو تجھ کو کسی کا ڈر نہ رہا۔ تیرے بھانویں مَیں کل کی مرتی آج مروں۔ تیرا من راضی ہو، تیری آسیں پوری ہوں۔ کس مرنے جوگی نے جنا اور کس لیکھ کی ریکھا نے میرے پلّے باندھ دیا —— اوں ہوں۔ تجھے موت نہیں آتی۔ تجھے کیوں آئے گی۔" اسی فقرے کی گردان کرتے ہوئے بے بے بھیڑنی کی طرح چوکے پر چڑھی کپڑے سے پتیلی پکڑ کر چولہے سے اٹھائی اور زمین پر دے ماری۔ گرم گرم چائے کے چھپاکے داؤجی کی پنڈلیوں اور پاؤں پر گرے اور وہ "او تیرا بھلا ہو جائے! او تیرا بھلا ہو جائے!" کہتے وہاں سے ایک بچے کی طرح بھاگے اور بیٹھک میں گھس گئے۔ ان کے اس

فرار بلکہ اندازِ فرار کو دیکھ کر میں اور بی بی ہنسے بنا نہ رہ سکے اور ہماری ہنسی کی آواز ایک ثانیہ کے لیے چاروں دیواروں سے ٹکرائی۔ میں تو خیر بچ گیا لیکن بے بے نے سیدھے جا کر بی بی کو بالوں سے پکڑ لیا اور چیخ کر بولی۔ "میری سوت! بتا بڈھے سے تیرا کیا ناطہ ہے؟ بتا نہیں تو ابھی پران لیتی ہوں۔ تو نے اس کو چائے کی کنجی کیوں دی؟" بی بی بچاری پھس پھس رونے لگی تو میں بھی اٹھ کر اندر بیٹھک میں کھسک آیا۔

داؤجی اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے تھے اور پاؤں سہلا رہے تھے۔ پتہ نہیں انہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے پھر کیوں گدگدی ہوئی کہ میں الماری کے اندر منہ کر کے ہنسنے لگا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پاس بلایا اور بولے۔ "شکر کرو گار کنم کہ گرفتارم بہ مصیبتے نہ کہ بہ معصیتے!" تھوڑی دیر رُک کر پھر کہا۔ "میں تو اس کے کتّوں کا بھی کتّا ہوں جس کے سر مطہّر پر مکّے کی ایک کم نصیب بڑھیا غلاظت پھینکا کرتی تھی۔"

میں نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بولے۔ "آقائے نامدار کا ایک ادنیٰ حلقہ بگوش گرم پانی کے چند چھینٹے پڑنے پر نالہ و شیون کرے تو لعنت ہے اس کی زندگی پر۔ وہ اپنے محبوب کے طفیل نارِ جہنم سے بچائے۔ خدائے ابراہیم مجھے جرأت عطا کر، مولائے ایوّب مجھے صبر کی نعمت دے۔"

مَیں نے کہا۔ "داؤجی آقائے نامدار کون؟"

تو داؤجی کو یہ سُن کر ذرا تکلیف ہوئی۔ انہوں نے شفقت سے کہا۔ "جانِ پدر، یوں نہ پوچھا کر۔ میرے استاد میرے حضرت کی روح کو مجھ سے بیزار نہ کر۔ وہ میرا آقا بھی تھے، میرے باپ بھی اور استاد بھی، وہ تیرے دادا استاد ہیں——دادا استاد——" اور انہوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔

آقائے نامدار کا لفظ اور کوتاہ قسمت مجوزہ کی ترکیب میں نے پہلی بار داؤجی سے سنی۔ یہ واقعہ سنانے میں انہوں نے کتنی ہی دیر لگا دی کیونکہ ایک ایک فقرے بعد فارسی کے بے شمار نعتیہ اشعار پڑھتے تھے اور بار بار اپنے استاد کی روح کو ثواب پہنچاتے تھے۔

جب وہ یہ واقعہ بیان کر چکے تو مَیں نے بڑے ادب سے پُوچھا۔ "داؤجی آپ کو اپنے استاد صاحب اس قدر اچھے کیوں لگتے تھے اور آپ ان کا نام لے کر ہاتھ کیوں

جوڑتے ہیں؟ اپنے آپ کو ان کا نوکر کیوں کہتے ہیں؟"

داؤجی نے مسکرا کر کہا۔ "جو طویلے کے ایک خر کو ایسا بنا دے کے لوگ کہیں یہ منشی چنت رام ہے۔ یہ منشی جی ہیں، وہ مسیحا نہ ہو وہ آقا نہ ہو تو پھر کیا ہو؟"

میں چارپائی کے کونے سے آہستہ آہستہ پھسل کر بستر میں پہنچ گیا اور چاروں طرف رضائی لپیٹ کر داؤجی کی طرف دیکھنے لگا جو سر جھکا کر کبھی اپنے پاؤں کی طرف دیکھتے تھے اور پنڈلیاں سہلاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے وقفوں بعد ذرا سا ہنسے اور پھر خاموش ہو جاتے—— کہنے لگے "مَیں کیا تھا اور کیا ہو گیا—— حضرت مولانا کی پہلی آواز کیا تھی! میری طرف سر مبارک اٹھا کر فرمایا، چوپال زادے ہمارے پاس آؤ۔ میں لاٹھی ٹیکتا ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ چھتہ پٹھاڑ اور دیگر دیہات کے لڑکے نیم دائرہ بنائے ان کے سامنے بیٹھے سبق یاد کر رہے تھے۔ ایک دربار لگا تھا اور کسی کو آنکھ اوپر اٹھانے کی ہمت نہ تھی—— میں حضور کے قریب گیا تو فرمایا، بھئی ہم تم کو ہر روز یہاں بکریاں چراتے دیکھتے ہیں۔ انہیں چرنے چگنے کے لیے چھوڑ کر ہمارے پاس آ جایا کرو اور کچھ پڑھ لیا کرو—— پھر حضور نے میری عرض سنے بغیر پوچھا، کیا نام ہے تمہارا؟ میں نے گنواروں کی طرح کہا چنتو—— حضرت مسکرائے—— تھوڑا ہنسے بھی—— فرمانے لگے، پورا نام کیا ہے؟ پھر خود ہی بولے چنت رام ہو گا—— میں نے سر ہلا دیا—— حضور کے شاگرد کتاب سے نظریں چرا کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میرے گلے میں کھدّر کا لمبا کرتہ تھا۔ پائجامہ کی بجائے صرف لنگوٹ بندھا تھا۔ پاؤں میں ادھوڑی کے موٹے جوتے اور سر پر سُرخ رنگ کا جانگیہ لپیٹا ہوا تھا۔ بکریاں میری——"

مَیں نے بات کاٹ کر پوچھا۔ "آپ بکریاں چراتے تھے داؤجی؟"

"ہاں ہاں۔" فخر سے بولے۔ "میں گڈریا تھا اور میرے باپ کی بارہ بکریاں تھیں۔"

حیرانی سے میرا منہ کُھلا کا کُھلا رہ گیا اور میں نے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے جلدی سے پوچھا۔ "اور آپ سکول کے پاس بکریاں چرایا کرتے تھے؟"

داؤجی نے کرسی چارپائی کے قریب کھینچ لی اور اپنے پاؤں پائے پر رکھ کر بولے۔ "جانِ پدر! اس زمانے میں تو شہروں میں بھی سکول نہ ہوتے تھے۔ میں گاؤں کی

بات کر رہا ہوں۔ آج سے چوہتر برس پہلے بھلا کوئی تمہارے ایم۔بی ہائی سکول کا نام بھی جانتا تھا؟ وہ تو میرے آقا کو پڑھانے کا شوق تھا۔ ارد گرد کے لوگ اپنے لڑکے چار حرف پڑھنے کو ان کے پاس بھیج دیتے ــــ ان کا سارا خاندان زیورِ علم سے آراستہ تھا اور دینی نعمتوں سے مالامال تھا۔ والد ان کے ضلع بھر کے ایک ہی حکیم اور چوٹی کے مبلّغ تھے۔ جدِّ امجد مہاراجہ کشمیر کے میر منشی۔ گھر میں علم کے دریا بہتے تھے۔ فارسی عربی، جبر و مقابلہ، اقلیدس حکمت اور علم ہیئت ان کے گھر کی لونڈیاں تھیں۔ حضور کے والد کو دیکھنا مجھے نصیب نہیں ہوا لیکن آپ کی زبانی ان کی تبحرِ علمی کی سب داستانیں سنیں۔ شیفتہؔ اور حکیم مومن خان مومن سے ان کے بڑے مراسم تھے اور خود حضرت مولانا کی تعلیم دِلّی میں مفتی آزردہ مرحوم کی نگرانی میں ہوئی تھی ــــ"

مجھے داؤجی کے موضوع سے بھٹک جانے کا ڈر تھا اس لیے مَیں نے جلدی سے پوچھا۔ "پھر آپ نے حضرت مولانا کے پاس پڑھنا شروع کر دیا۔"

"ہاں۔" داؤجی اپنے آپ سے باتیں کرنے لگے۔ "ان کی باتیں ہی ایسی تھیں۔ ان کی نگاہیں ہی ایسی تھیں۔ جس کی طرف توجہ فرماتے تھے۔ بندے سے مولا کر دیتے تھے ــــ مَیں تو اسی وقت لاٹھی زمین پر ڈال ان کے پاس بیٹھ گیا۔ فرمایا اپنے بھائیوں کے پاس بوریے پر بیٹھو۔ مَیں نے کہا، جی اٹھارہ برس دھرتی پر بیٹھے گزر گئے، اب کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر مسکرا دیے۔ اپنے چوبی صندوقچے سے حروفِ ابجد کا ایک مقوا نکالا اور بولے الف، بے، پے، تے ــــ سبحان اللہ کیا آواز تھی، کس شفقت سے بولے تھے، کس لہجہ سے فرما رہے تھے۔ الف، بے، پے، تے" اور داؤجی ان حرفوں کا ورد کرتے ہوئے اپنے ماضی میں کھو گئے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ادھر رہنٹ تھا اور اس کے ساتھ مچھلیوں کا حوض۔ پھر انہوں نے بایاں ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا۔ "اور اس طرف مزارعین کے کوٹھے۔ دونوں کے درمیان حضور کا باغیچہ تھا اور سامنے ان کی قدیم عظیم الشّان حویلی۔ اسی باغیچے میں ان کا مکتب لگتا تھا۔ درِ فیض کھلا تھا جس کا جی چاہے آئے نہ مذہب کی قید نہ مسلک کی پابندی ــــ"

مَیں نے کافی دیر سوچنے کے بعد باادب باملاحظہ قسم کا فقرہ تیار کر کے پوچھا۔ "حضرت مولانا کا اسمِ گرامی شریف کیا تھا؟" تو پہلے انہوں نے میرا فقرہ ٹھیک کیا اور

پھر بولے۔ "حضرت اسماعیل چشتی رحمتہ اللہ علیہ۔ فرماتے تھے کہ ان کے والد ہمیشہ انہیں جانِ جاناں کہہ کر پکارتے تھے۔ کبھی جانِ جاناں کی رعایت سے مظہر جانِ جاناں بھی کہہ دیتے تھے۔"

میں ایسی دلچسپ کہانی سننے کا ابھی اور خواہش مند تھا کہ داؤجی اچانک رک گئے اور بولے۔ "سب سڈی ایری سسٹم کیا تھا؟" ان انگریزوں کا بُرا ہو یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں آئیں یا ملکہ وکٹوریہ کا فرمان لے کر' سارے معاملے میں کھنڈت ڈال دیتے ہیں۔ سوا کے پہاڑے کی طرح میں نے سب سڈی ایری سسٹم کا سارا ڈھانچہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پھر انہوں نے میز سے گرائمر اٹھائی اور بولے۔ "باہر جا کر دیکھ کے آ کہ تیری بے بے کا غصہ کم ہوا کہ نہیں۔" مَیں دوات میں پانی ڈالنے کے بہانے باہر گیا تو بے بے کو مشین چلاتے اور بی بی کو چوکا صاف کرتے پایا۔

داؤجی کی زندگی میں بے بے والا پہلو بڑا ہی کمزور تھا۔ جب وہ دیکھتے کہ گھر میں مطلع صاف ہے اور بے بے کے چہرے پر کوئی شکن نہیں ہے تو وہ پکار کر کہتے۔ "سب ایک ایک شعر سناؤ۔" پہلے مجھی سے تقاضا ہوتا اور مَیں چھوٹتے ہی کہتا ۔

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

اس پر وہ تالی بجاتے اور کہتے۔ "اوّلیں شعر نہ سنوں گا، اردو کم سنوں گا اور مسلسل نظم کا ہرگز نہ سنوں گا۔" مَیں کہتا۔ "مجھے سوچنے دیجئے، اتنے میں بی بی سنائے۔"

بی بی بھی میری طرح اکثر اس شعر سے شروع کرتی۔

شنیدم کہ شاپور دم در کشید
چو خسرو براتش قلم در کشید

اس پر داؤجی ایک مرتبہ پھر آرڈر آرڈر پکارتے۔

بی بی قینچی رکھ کر کہتی۔

"شورے شد واز خوابِ عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی ست شبِ فتنہ غنودیم"

داؤجی شاباش تو ضرور کہہ دیتے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے کہ "بیٹا یہ شعر تو کئی مرتبہ سُنا چکی ہے۔"

پھر وہ بے بے کی طرف دیکھ کر کہتے۔ "بھئی آج تمہاری بے بے بھی ایک شعر سنائے گی۔" مگر بے بے ایک ہی روکھا سا جواب دیتی۔ "مجھے نہیں آتے شیر کبت۔" اس پر داؤجی کہتے "گھوڑیاں ہی سنادے۔ اپنے بیٹوں کے بیاہ کی گھوڑیاں ہی گا دے۔" اس پر بے بے کے ہونٹ مسکرانے کو کرتے لیکن وہ مسکرا نہ سکتی اور داؤجی عین عورتوں کی طرح گھوڑیاں گانے لگتے۔ ان کے درمیان کبھی امی چند کا کبھی میرا نام ٹانک دیتے، پھر کہتے۔ "مَیں اپنے اس گولو مولو کی شادی پر سرخ پگڑی باندھوں گا۔ برات میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ چلوں گا اور نکاح نامہ پر شہادت کے دستخط کروں گا۔" مَیں دستور کے مطابق شرما کر نگاہیں نیچی کر لیتا تو وہ کہتے۔ "پتہ نہیں اس ملک کے کسی شہر میں میری چھوٹی سی بہو پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھ رہی ہو گی۔ ہفتہ میں ایک دن لڑکیوں کی خانہ داری ہوتی ہے۔ اس نے تو بہت سی چیزیں پکانی سیکھ لی ہوں گی۔ پڑھنے میں بھی ہوشیار ہو گی۔ اس بدھو کو تو یہ یاد نہیں رہتا کہ مادیاں گھوڑی ہوتی ہے یا مرغی۔ وہ تو فرفر سب کچھ سناتی ہو گی۔ میں تو اس کو فارسی پڑھاؤں گا۔ پہلے اس کو خطاطی کی تعلیم دوں گا۔ پھر خطِ شکستہ سکھاؤں گا۔ مستورات کو خطِ شکستہ نہیں آتا۔ مَیں تو اپنی بہو کو سکھادوں گا — سن گولو! پھر میں تیرے ہی پاس رہوں گا۔ مَیں اور میری بہو فارسی میں باتیں کریں گے۔ وہ بات بات پر بقر مائید کہے گی اور تو احمقوں کی طرح منہ دیکھا کرے گا۔" پھر وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے خیلے خوب خیلے خوب کہتے۔ جان پدر چرا ایں قدر زحمت می کش — خوب — یادوارم — اور پتہ نہیں کیا کچھ کہتے۔ بچارے داؤجی! چٹائی پر اپنی چھوٹی سی دنیا بسا کر اس میں فارسی کے فرمان جاری کیے جاتے — ایک دن جب چھت پر دھوپ میں بیٹھے ہوئے وہ ایسی ہی دنیا بسا چکے تھے تو ہولے سے مجھے کہنے لگے۔ "جس طرح خدا نے تجھے ایک نیک سیرت بیوی اور مجھے سعادت مند بہو عطا کی ہے، ویسے ہی وہ اپنے فضل سے میری امی چند کو بھی دے گا۔ اس کے خیالات کچھ مجھے اچھے نہیں لگتے۔ یہ سیوا سنگ یہ مسلم لیگ یہ بیلچہ پارٹیاں مجھے پسند نہیں اور امی چند لاٹھی چلانا گتکا کھیلنا سیکھ رہا ہے۔ میری تو وہ کب مانے گا، ہاں خدائے بزرگ و برتر اس کو

ایک نیک مومن سی بیوی دلا دے تو وہ اسے راہِ راست پر لے آئے گی۔"

اس مومن کے لفظ پر مجھے بہت تکلیف ہوئی اور میں چُپ سا ہو گیا۔ چُپ محض اس لیے ہوا تھا کہ اگر میں نے منہ کھولا تو یقیناً ایسی بات نکلے گی جس سے داؤجی کو بڑا دکھ ہو گا — میری اور امی چند کی تو خیر باتیں ہی تھیں لیکن 12 جنوری کو بی بی کی برات سچ مچ آ گئی۔ جیجا جی رام پرتاب کے بارے میں داؤجی مجھے بہت کچھ بتا چکے تھے کہ وہ بہت اچھا لڑکا ہے اور اس شادی کے بارے میں انہوں نے جو استخارہ کیا تھا، اس پر وہ پورا اترا ہے۔ سب سے زیادہ خوشی داؤجی کو اس بات کی تھی کہ ان کے سمدھی فارسی کے استاد تھے اور کبیر پنتھی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ بارہ تاریخ کی شام کو جب بی بی وداع ہونے لگی تو گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ بے بے زار و قطار رو رہی ہے۔ امی چند آنسو بہا رہا ہے اور محلے کی عورتیں پُھس پُھس کر رہی ہیں۔ میں دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہوں اور داؤجی میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں اور بار بار کہہ رہے ہیں۔ "آج زمین کچھ میرے پاؤں نہیں پکڑتی۔ میں توازن قائم نہیں رکھ سکتا۔" جیجا جی کے باپ بولے۔ "منشی جی اب ہمیں اجازت دیجیے۔" تو بی بی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔ اسے چارپائی پر ڈالا۔ عورتیں ہوا کرنے لگیں اور داؤجی میرا سہارا لے کر اس کی چارپائی کی طرف چلے۔ انہوں نے بی بی کو کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا۔ "یہ کیا ہوا بیٹا۔ اٹھو! یہ تو تمہاری نئی اور خود مختار زندگی کی پہلی گھڑی ہے۔ اسے یوں منحوس نہ بناؤ۔" بی بی اسی طرح دھاڑیں مارتے ہوئے داؤجی سے لپٹ گئی۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "قرۃ العین میں تیرا گنہگار ہوں کہ تجھے پڑھا نہ سکا۔ تیرے سامنے شرمندہ ہوں کہ تجھے علم کا جہیز نہ دے سکا۔ تو مجھے معاف کر دے گی اور شاید برخوردار رام پرتاب بھی لیکن مَیں اپنے آپ کو معاف نہ کر سکوں گا۔ میں خطاکار ہوں اور میرا خجل سر تیرے سامنے خم ہے۔" یہ سن کر بی بی اور بھی زور زور سے رونے لگی اور داؤجی کی آنکھوں سے کتنے سارے موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے ٹوٹ کر زمین پر گرے۔ ان کے سمدھی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "منشی جی آپ فکر نہ کریں، بیٹی کو میں کریما پڑھا دوں گا۔" داؤجی ادھر پلٹے اور ہاتھ جوڑ کر بولے۔ "کریما تو پڑھ چکی ہے۔ گلستان بوستان بھی ختم کرا چکا ہوں لیکن میری حسرت پوری نہیں ہوئی۔" اس پر وہ ہنس کر

بولے۔ "آپ بھی حد کرتے ہیں۔ ساری گلستاں تو مَیں نے بھی نہیں پڑھی، جہاں عربی آتی تھی، آگے گزر جاتا تھا۔"

—— داؤجی اسی طرح ہاتھ جوڑے کتنی دیر خاموش کھڑے رہے۔ بی بی نے گوٹہ لگی سرخ رنگ کی ریشمی چادر سے ہاتھ نکال کر پہلے امی چند کے اور پھر میرے سر پر پھیرا اور سکھیوں کے بازوؤں میں ڈیوڑھی کی طرف چل دی۔ داؤجی میرا سہارا لے کر چلے تو انہوں نے مجھے اپنے ساتھ زور سے بھینچ کر کہا۔ "لو یہ بھی رو رہا ہے۔ دیکھو یہ ہمارا سہارا بنا پھرتا ہے۔ او گولو—— او مردم دیدہ—— تجھے کیا ہو گیا—— جانِ پدر تو کیوں——؟"

اس پر ان کا گلا رندھ گیا اور میرے آنسو بھی تیز ہو گئے۔ برات والے تانگوں اور اکوں پر سوار تھے۔ بی بی رتھ میں جا رہی تھی اور اس کے پیچھے امی چند اور میں اور ہمارے درمیان داؤجی پیدل چل رہے تھے۔ اگر بی بی کی چیخ ذرا زور سے نکل جاتی تو داؤجی آگے بڑھ کر رتھ کا پردہ اٹھاتے اور کہتے۔ "لاحول پڑھو بیٹا، لاحول پڑھو۔"

اور خود آنکھوں پر رکھے ان کی پگڑی کا شملہ بھیگ گیا تھا!

رانو ہمارے محلے کا بڑا ہی کثیف سا انسان تھا۔ بدی اور کینہ پروری اس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ باڑہ جس کا مَیں نے ذکر کیا ہے، اُسی کا تھا۔ اس میں بیس پچیس بکریاں اور دو گائیں تھیں جن کا دودھ صبح و شام رانو گلی کے بغلی میدان میں بیٹھ کر بیچا کرتا۔ تقریباً سارے محلے والے اسی سے دودھ لیتے تھے اور اس کی شرارتوں کی وجہ سے دبتے بھی تھے۔ ہمارے گھر کے آگے سے گزرتے ہوئے وہ یونہی شوقیہ لاٹھی زمین پر بجا کر داؤجی کو "پنڈ تا جے رام جی کی" کہہ کر سلام کیا کرتا۔ داؤجی نے اسے کئی مرتبہ سمجھایا کہ وہ پنڈت نہیں ہیں، معمولی آدمی ہیں کیونکہ پنڈت ان کے نزدیک پڑھے لکھے اور فاضل آدمی کو کہا جا سکتا تھا لیکن رانو نہیں مانتا تھا۔ وہ اپنی مونچھ چبا کر کہتا۔ "لے بھئی جس کے سر پر بودی (چٹیا) ہو، وہ پنڈت ہی ہوتا ہے"—— چوروں یاروں سے اس کی آشنائی تھی۔ شام کو اس کے باڑے میں جُوا بھی ہوتا اور گندی اور فحش بولیوں کا مشاعرہ بھی۔ بی بی کے جانے کے بعد ایک دن جب میں اس سے دودھ لینے گیا تو اس نے شرارت سے ایک آنکھ میچ کر کہا۔ "مورنی تو چلی گئی بابو! اب تو

اس گھر میں رہ کر کیا لے گا؟" میں چپ رہا تو اس نے جاگ والے دودھ میں ڈبہ پھیرتے ہوئے کہا۔ "گھر میں گنگا بہتی تھی، سچ بتا غوطہ لگایا کہ نہیں؟" مجھے اس بات پر غصہ آ گیا اور میں نے تاملوٹ گھما کر اس کے سر پر دے مارا۔ اس ضرب شدید سے خون وغیرہ تو برآمد نہ ہوا لیکن وہ چکرا کر تخت پر گر پڑا اور میں گھر بھاگ گیا۔ داؤ کو سارا واقعہ سنا کر میں دوڑا دوڑا اپنے گھر گیا اور اباجی سے ساری حکایت بیان کی۔ ان کی بدولت رانو کی تھانہ میں طلبی ہوئی اور حوالدار صاحب نے ہلکی سی گوشمالی کے بعد اسے سخت تنبیہ کر کے چھوڑ دیا۔ اس دن کے بعد سے رانو داؤجی پر آتے جاتے طرح طرح کے فقرے کسنے لگا۔ وہ سب سے زیادہ مذاق ان کی بودی کا اڑایا کرتا تھا اور واقعی داؤجی کے فاضل سر پر وہ چٹی سی بودی ذرا بھی اچھی نہ لگتی تھی مگر وہ کہتے تھے۔ "یہ میری مرحوم ماں کی نشانی ہے اور مجھے زندگی کی طرح عزیز ہے۔ وہ اپنی آغوش میں میرا سر رکھ کے اسے دہی سے دھوتی تھی اور کڑوا تیل لگا کر چمکاتی تھی۔" گو مَیں نے حضرت مولانا کے سامنے کبھی بھی پگڑی اتارنے کی جسارت نہیں کی لیکن وہ جانتے تھے اور جب میں دیال چند میموریل ہائی سکول سے ایک سال کی ملازمت کے بعد چھٹیوں پر گاؤں آیا تو حضور نے پوچھا۔ "شہر جا کر چوٹی تو نہیں کٹوا دی؟" میں نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر بہت خوش ہوئے اور فرمایا "تم سا سعادت مند بیٹا کم ماؤں کو نصیب ہوتا ہے اور ہم سا خوش قسمت استاد بھی خال خال ہو گا جسے تم ایسے شاگردوں کو پڑھانے کا فخر حاصل ہوا ہو۔" میں نے ان کے پاؤں چُھو کر کہا۔ "حضور آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ یہ سب آپ کے قدموں کی برکت ہے۔" ہنس کر فرمانے لگے۔ "چنت رام ہمارے پاؤں نہ چُھوا کرو۔ بھلا ایسے لمس سے کیا فائدہ جس کا ہمیں احساس نہ ہو۔" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے کہا۔ "اگر کوئی مجھے بتا دے تو سمندر پھاڑ کر بھی آپ کے لیے دوائی نکال لاؤں۔ اپنی زندگی کی حرارت حضور کی ٹانگوں کے لیے نذر کروں لیکن میرا بس نہیں چلتا——" خاموش ہو گئے اور نگاہیں اوپر اٹھا کر بولے۔ "خدا کو یہی منظور ہے تو ایسے ہی سہی۔ تم سلامت رہو کہ تمہارے کندھوں پر میں نے کوئی دس سال بعد سارا گاؤں دیکھ لیا ہے——" داؤجی گزرے ایام کی تہہ میں اترتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ "میں صبح سویرے حویلی کی ڈیوڑھی میں جا کر آواز دیتا۔ خادم آ گیا۔" مستورات ایک طرف ہو

جاتیں تو حضور صحن سے آواز دے کر مجھے بلاتے اور میں اپنی قسمت کو سراہتا ہاتھ جوڑے جوڑے ان کی طرف بڑھتا۔ پاؤں چھوتا اور حکم کا انتظار کرنے لگتا۔ وہ دعا دیتے، میرے والدین کی خیریت پوچھتے، گاؤں کا حال دریافت فرماتے اور پھر کہتے۔ "لو بھئی چنت رام اب اس گناہوں کی گٹھڑی کو اٹھالو۔" میں سبد گل کی طرح انہیں اٹھاتا اور کمر پر لاکر حویلی سے باہر آجاتا۔ کبھی فرماتے "ہمیں باغ کا چکر دو۔ کبھی حکم ہوتا سیدھے رہٹ کے پاس لے چلو اور کبھی کبھار بڑی نرمی سے کہتے چنت رام تھک نہ جاؤ تو ہمیں مسجد تک لے چلو۔" میں نے کئی بار عرض کیا کہ حضور ہر روز مسجد لے جایا کروں گا مگر نہیں مانے۔ یہی فرماتے رہے کہ کبھی جی چاہتا ہے اور جب جی چاہتا ہے، تم سے کہہ دیتا ہوں۔ میں انہیں وضو کرانے والے چبوترے پر بٹھاکر ان کے ہلکے ہلکے جوتے اتارتا اور انہیں جھولی میں رکھ کر دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ چبوترے سے حضور خود گھسٹ کر صف کی جانب جاتے تھے۔ میں نے صرف ایک مرتبہ انہیں اس طرح جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے بعد جرأت نہ ہوئی۔ ان کے جوتے اتارنے کے بعد دامن میں منہ چھپالیتا اور پھر اسی وقت سر اٹھاتا جب وہ میرا نام لے کر یاد فرماتے۔ واپسی پر میں قصبے کی لمبی لمبی گلیوں کا چکر کاٹ کر حویلی کو لوٹتا تو فرماتے "ہم جانتے ہیں چنت رام تم ہماری خوشنودی کے لیے قصبہ کی سیر کراتے ہو لیکن ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ایک تو تم پر لدا لدا پھرتا ہوں، دوسرے تمہارا وقت ضائع کرتا ہوں۔" اور حضور سے کون کہہ سکتا کہ آقا یہ وقت ہی میری زندگی کا نقطہ عروج ہے اور یہ تکلیف ہی میری حیات کا مرکز ہے۔ آپ تو فرماتے تھے کہ لدا لدا پھرتا ہوں اور مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایک ہما ہے جس نے اپنا سایہ محض میرے لیے وقف کر دیا ہے۔

جس دن میں نے سکندر نامہ زبانی یاد کر کے انہیں سنایا، اس قدر خوش ہوئے گویا ہفت اقلیم کی بادشاہی نصیب ہو گئی ہو۔ دین و دنیا کی ہر دعا سے مجھے مالا مال کیا۔ دست شفقت میرے سر پر پھیرا اور جیب سے ایک روپیہ نکال کر انعام دیا۔ میں نے اسے حجر اسود جان کر بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگایا اور سکندر کا افسر سمجھ کر پگڑی میں رکھ لیا۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر دعائیں دے رہے تھے اور فرما رہے تھے۔ "جو کام ہم سے نہ ہو سکا، وہ تو نے کر دکھایا۔ تو نیک ہے، خدا نے یہ سعادت تجھے نصیب کی۔ چنت رام تیرا

موسیٰ چوپاں کا پیشہ ہے تو شاہِ بطحا کا پیرو ہے۔ اس لیے خدائے عزوجل تجھے برکت دیتا ہے۔ وہ تجھے اور بھی برکت دے گا۔ تجھے اور کشائش میسر آئے گی۔"

داؤجی یہ باتیں کرتے کرتے سر گھٹنوں پر رکھ کر خاموش ہو گئے۔

میرا امتحان قریب آرہا تھا اور داؤجی سخت ہوتے جارہے تھے۔ انہوں نے میرے ہر فارغ وقت پر کوئی نہ کوئی کام پھیلا دیا تھا۔ ایک مضمون سے عہدہ برآ ہوتا تھا تو دوسرے کی کتابیں نکال کر سر پر سوار ہو جاتے تھے۔ پانی پینے اُٹھتا تو سایہ کی طرح ساتھ ساتھ چلے آتے اور نہیں تو تاریخ کے سن ہی پوچھتے جاتے۔ شام کے وقت سکول پہنچنے کا انہوں نے وطیرہ بنا لیا تھا۔ ایک دن میں سکول کے بڑے دروازے سے نکلنے کے بجائے بورڈنگ ہاؤس کی راہ کھسک گیا تو انہوں نے جماعت کے کمرے کے سامنے آکر بیٹھنا شروع کر دیا۔ میں چڑچڑا اور ضدی ہونے کے علاوہ بدزبان بھی ہو گیا تھا۔ داؤ کے بچے گویا میرا تکیہ کلام بن گیا تھا اور کبھی کبھی جب ان کی یا ان کے سوالات کی سختی بڑھ جاتی تو میں انہیں کتے کہنے سے بھی نہ چوکتا۔ ناراض ہو جاتے تو بس اسی قدر کہتے۔ "دیکھ لے ڈومنی تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ تیری بیوی بیاہ کر لاؤں گا تو پہلے اسے یہی بتاؤں گا کہ جانِ پدر یہ تیرے بڈھے باپ کو کتا کہتا تھا۔" میری گالیوں کے بدلے وہ مجھے ڈومنی کہا کرتے تھے۔ اگر انہیں زیادہ دکھ ہوتا تو منہ چڑھی ڈومنی کہتے۔ اس سے زیادہ نہ انہیں غصہ آتا تھا، نہ دکھ ہوتا تھا۔ مجھے میرے اصلی نام سے انہوں نے کبھی نہیں پکارا۔ میرے بڑے بھائی کا ذکر آتا تو بیٹا آفتاب، برخوردار آفتاب کہہ کر انہیں یاد کرتے تھے لیکن میرے ہر روز نئے نئے نام رکھتے تھے جن میں گولو انہیں بہت مرغوب تھا۔ طنبورا دوسرے درجہ پر مسٹر ہونق اور اخفش اسکوائران سب کے بعد آتے تھے اور ڈومنی صرف غصہ کی حالت میں۔ کبھی کبھی میں ان کو بہت دق کرتا، وہ اپنی چٹائی پر بیٹھے کچھ پڑھ رہے ہیں۔ مجھے الجبرے کا ایک سوال دے رکھا ہے اور میں سارے جہان کی ابجد کو ضرب دے کر تنگ آچکا ہوں تو میں کاپیوں اور کتابوں کے ڈھیر کو پاؤں سے پرے دھکیل کر اُونچے اُونچے گانے لگتا۔

تیرے سامنے بیٹھ کے رونا تے دکھ تینوں نیوں دسنا

داؤجی حیرانی سے میری طرف دیکھتے تو میں تالیاں بجانے لگتا اور قوالی شروع کر

دیتا۔ نیوں نیوں دسناتے دکھ تینوں نیوں دسنا۔۔۔ دسناد سناد سناد سنا۔۔۔ تینوں تینوں تینوں تینوں۔ سارے گاما رونا رونا رونا سارے گاما رونا روناتے دکھ تینوں نیوں دسنا۔ وہ عینک کے اوپر سے مسکراتے۔ میرے پاس آکر کاپی اٹھاتے۔ صفحہ نکالتے اور میری تالیوں کے درمیان اپنا بڑا سا ہاتھ کھڑا کر دیتے۔ "سن بیٹا!" وہ بڑی محبت سے کہتے۔ "یہ کوئی مشکل سوال ہے!" جونہی وہ سوال سمجھانے کے لیے ہاتھ نیچے کرتے، میں پھر تالیاں بجانے لگتا۔ "دیکھ پھر، مَیں تیرا داؤ نہیں ہوں؟" وہ بڑے مان سے پوچھتے۔

"نہیں!" مَیں منہ پھاڑ کر کہتا۔

"تو اور کون ہے؟" وہ مایوس سے ہو جاتے۔

"وہ سچّی سرکار۔" مَیں انگلی آسمان کی طرف کر کے شرارت سے کہتا۔ "وہ سچی سرکار، وہ سب کا پالنے والا۔۔۔ بول بکرے سب کا والی کون؟"

وہ میرے پاس سے اُٹھ کر جانے لگتے تو میں ان کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا۔

"داؤجی خفا ہو گئے کیا؟"

وہ مسکرانے لگتے۔ "چھوڑ طنبورے! چھوڑ بیٹا! میں تو پانی پینے جا رہا تھا۔۔۔ مجھے پانی تو پی آنے دے۔"

مَیں جھوٹ موٹ بُرا مان کر کہتا۔ "لو جی جب مجھے سوال سمجھنا ہُوا داؤجی کو پانی یاد آ گیا۔"

وہ آرام سے بیٹھ جاتے اور کاپی کھول کر کہتے۔ "اخفش اسکوائر جب تجھے چار ایکس کا مربع نظر آرہا تھا تو نے تیسرا فارمولا کیوں نہ لگایا اور اگر ایسا نہ بھی کرتا تو۔۔۔"

اور اس کے بعد پتہ نہیں داؤجی کتنے دن تک پانی نہ پیتے۔

فروری کے دوسرے ہفتے کی بات ہے۔ امتحان میں کل ڈیڑھ مہینہ رہ گیا تھا اور مجھ پر آنے والے خطرناک وقت کا خوف بھوت بن کر سوار ہو گیا تھا۔ مَیں نے خود اپنی پڑھائی پہلے سے تیز کر دی تھی اور کافی سنجیدہ ہو گیا تھا لیکن جیومیٹری کے مسائل میری سمجھ میں نہ آتے تھے۔ داؤجی نے بہت کوشش کی لیکن کچھ بات نہ بنی۔ آخر ایک دن انہوں نے کہا۔ کل باون پر اپوزیشنیں ہیں، زبانی یاد کر کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ میں انہیں رٹنے میں مصروف ہو گیا لیکن جو پر اپوزیشن رات کو یاد کرتا،

صبح بھول جاتی۔ میں دلبرداشتہ ہو کر ہمت چھوڑ سی بیٹھا۔ ایک رات داؤجی مجھ سے جیومیٹری کی شکلیں بنوا کر اور مشقیں سن کر اٹھے تو وہ بھی کچھ پریشان سے ہو گئے تھے۔ میں بار بار اٹکا تھا اور انہیں بہت کوفت ہوئی تھی۔ مجھے سونے کی تاکید کر کے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تو میں کاپی پنسل لے کر پھر بیٹھ گیا اور رات کے ڈیڑھ بجے تک لکھ لکھ کر رٹا لگاتا رہا مگر جب کتاب بند کر کے لکھنے لگتا تو چند فقروں کے بعد اٹک جاتا۔ مجھے داؤجی کا مایوس چہرہ یاد کر کے اور اپنی حالت کا اندازہ کر کے رونا آ گیا اور میں باہر صحن میں آکر سیڑھیوں پر بیٹھ کے سچ مچ رونے لگا۔ گھٹنوں پر سر رکھ کے رو رہا تھا اور سردی کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا تو مَیں نے داؤ جی کی عزت بچانے کے لیے یہی ترکیب سوچی کہ ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر نکل جاؤں اور پھر واپس نہ آؤں۔ جب فیصلہ کر چکا اور عملی قدم آگے بڑھانے کے لیے سر اوپر اٹھایا تو داؤجی کمبل اوڑھے میرے پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے بڑے پیار سے اپنے ساتھ لگایا تو سسکیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ صحن میں پھیل گیا۔ داؤجی نے میرا سر چُوم کر کہا۔ "لے بھائی طنبورے، مَیں تو یوں نہ سمجھتا تھا۔ تو تو بہت ہی کم ہمت نکلا۔" پھر انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کمبل میں لپیٹ لیا اور بیٹھک میں لے گئے۔ بستر میں بٹھا کر انہوں نے میرے چاروں طرف رضائی لپیٹی اور خود پاؤں اوپر کر کے کرسی پر بیٹھ گئے۔

انہوں نے کہا اقلیدس چیز ہی ایسی ہے تو اس کے ہاتھوں یوں نالاں ہے۔ میں اس سے اور طرح تنگ ہوا تھا۔ حضرت مولانا کے پاس جبر و مقابلہ اور اقلیدس کی جس قدر کتابیں تھیں، انہیں میں اچھی طرح سے پڑھ کر اپنی کاپیوں پر اُتار چکا تھا۔ کوئی ایسی بات نہ تھی جس میں الجھن ہوتی۔ میں نے یہ جانا کہ ریاضی کا ماہر ہو گیا ہوں لیکن ایک رات میں اپنی کھاٹ پر پڑا متساوی الساقین کے ایک مسئلہ پر غور کر رہا تھا کہ بات الجھ گئی۔ مَیں نے دیا جلا کر شکل بنائی اور اس پر غور کرنے لگا۔ جبر و مقابلہ کی رو سے مفروضہ کا جواب ٹھیک آتا تھا لیکن علم ہندسہ سے پایہ ثبوت کو نہ پہنچتا تھا۔ مَیں ساری رات کاغذ سیاہ کرتا رہا لیکن تیری طرح سے رویا نہیں۔ علی الصبح مَیں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے اپنے دستِ مبارک سے کاغذ پر شکل کھینچ کر سمجھانا شروع کیا لیکن جہاں مجھے الجھن ہوئی تھی۔ وہیں حضرت مولانا کی طبع رسا کو بھی کوفت ہوئی۔ فرمانے

لگے۔ ”چنت رام، اب ہم تم کو نہیں پڑھا سکتے۔ جب استاد اور شاگرد کا علم ایک سا ہو جائے تو شاگرد کو کسی اور معلم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔“ میں نے جرأت کر کے کہہ دیا کہ حضور اگر کوئی اور یہ جملہ کہتا تو میں اسے کفر کے مترادف سمجھتا لیکن آپ کا ہر حرف اور ہر شوشہ میرے لیے حکمِ ربانی سے کم نہیں، اس لیے خاموش ہوں۔ بھلا آقائے غزنوی کے سامنے ایاز کی کیا مجال! لیکن حضور مجھے دکھ بہت ہوا ہے۔ فرمانے لگے۔ ”تم بے حد جذباتی آدمی ہو۔ بات تو سُن لی ہوتی۔“ مَیں نے سر جھکا کر کہا۔ ”ارشاد۔“ فرمایا ”دلی میں حکیم ناصر علی سیستانی علم ہندسہ کے بڑے ماہر ہیں۔ اگر تم کو اس کا ایسا ہی شوق ہے تو ان کے پاس چلے جاؤ اور اکتساب علم کرو۔ ہم ان کے نام رقعہ لکھ دیں گے۔“ مَیں نے رضامندی ظاہر کی تو فرمایا۔ ”اپنی والدہ سے پوچھ لینا، اگر وہ رضامند ہوں تو ہمارے پاس آنا——“ والدہ مرحومہ سے پوچھنا اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق جواب پانا انہونی بات تھی۔ چنانچہ میں نے ان سے نہیں پوچھا۔ حضور پوچھتے تو میں دروغ بیانی سے کام لیتا کہ گھر کی لپائی پتائی کر رہا ہوں۔ جب فارغ ہوں گا تو والدہ سے عرض کروں گا۔ چند ایام بڑے اضطرار کی حالت میں گزرے۔ میں دن رات اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کرتا مگر صحیح جواب برآمد نہ ہوتا۔ اس لاینحل مسئلہ سے طبیعت میں اور انتشار پیدا ہوا۔ میں دلی جانا چاہتا تھا لیکن حضور سے اجازت نہ مل سکتی تھی نہ رقعہ۔ وہ والدہ کی رضامندی کے بغیر اجازت دینے والے نہ تھے اور والدہ اس بڑھاپے میں کیسے آمادہ ہو سکتی تھیں—— ایک رات جب سارا گاؤں سو رہا تھا اور میں تیری طرح پریشان تھا تو میں نے اپنی والدہ کی پٹاری سے اس کی کل پونجی سے دو روپے چرا لیے اور نصف اس کے لیے چھوڑ کر گاؤں سے نکل گیا۔ خدا مجھے معاف کرے اور میرے دونوں بزرگوں کی روحوں کو مجھ پر مہربان رکھے! واقعی میں نے بڑا گناہ کیا اور ابد تک میرا سر ان دونوں کرم فرماؤں کے سامنے ندامت سے جھکا رہے گا—— گاؤں سے نکل کر میں حضور کی حویلی کے پیچھے ان کے مسند کے پاس پہنچا جہاں بیٹھ کر آپ پڑھاتے تھے۔ گھٹنوں کے بل ہو کر میں نے زمین کو بوسہ دیا اور دل میں کہا۔ بد قسمت ہوں، بے اجازت جا رہا ہوں لیکن آپ کی دعاؤں کا عمر بھر محتاج رہوں گا۔ میرا قصور معاف نہ کیا تو آپ کے قدموں میں جان دے دوں گا۔ اتنا کہہ کر اور لاٹھی کندھے پر

رکھ کر میں وہاں سے چل دیا—— سن رہا ہے؟“ داؤ جی نے میری طرف غور سے دیکھ کر پوچھا۔

رضائی کے بیچ خار پشت بنے مَیں نے آنکھیں جھپکائیں اور ہولے سے کہا۔

”جی؟“

داؤ جی نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”قدرت نے میری کمال مدد کی۔ ان دنوں جاکھل جنید سرسہ حصار والی ریل کی پٹڑی بن رہی تھی۔ یہی سیدھا راستہ دلی کو جاتا تھا اور یہیں مزدوری ملتی تھی۔ ایک دن میں مزدوری کرتا اور دو دن چلتا۔ اس طرح تائید غیبی کے سہارے سولہ دن میں مَیں دلی پہنچ گیا۔ منزلِ مقصود تو ہاتھ آ گئی تھی، لیکن گوہرِ مقصود کا سراغ نہ ملتا تھا۔ جس کسی سے پوچھتا، حکیم ناصر علی سیستانی کا دولت خانہ کہاں ہے؟ نفی میں جواب ملتا۔ دو دن ان کی تلاش جاری رہی لیکن پتہ نہ پا سکا۔ قسمت یاور تھی، صحت اچھی تھی۔ انگریزوں کے لیے نئی کوٹھیاں بن رہی تھیں۔ وہاں کام پر جانے لگا۔ شام کو فارغ ہو کر حکیم صاحب کا پتہ معلوم کرتا اور رات کے وقت ایک دھرم شالہ میں کھیس پھینک کر گہری نیند سو جاتا۔ مثل مشہور ہے جوئندہ یابندہ! آخر ایک دن مجھے حکیم صاحب کی جائے رہائش معلوم ہو گئی۔ وہ پتھر پھوڑوں کے محلے کی ایک تیرہ و تار گلی میں رہتے تھے۔ شام کے وقت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں فروکش تھے اور چند دوستوں سے اونچے اونچے گفتگو ہو رہی تھی۔ میں جوتے اتار کر دہلیز کے اندر کھڑا ہو گیا۔ ایک صاحب نے پوچھا۔ ”کون ہے؟“ میں نے سلام کر کے کہا۔ ”حکیم صاحب سے ملنا ہے۔“ حکیم صاحب دوستوں کے حلقہ میں سر جھکائے بیٹھے تھے اور ان کی پشت میری طرف تھی۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے بولے۔ ”اسم گرامی؟“ مَیں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”پنجاب سے آیا ہوں اور——“ میں بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ زور سے بولے۔ ”اوہو! چنت رام ہو؟“ مَیں کچھ جواب نہ دے سکا۔ فرمانے لگے۔ ”مجھے اسماعیل کا خط ملا ہے۔ لکھتا ہے شاید چنت رام تمہارے پاس آئے۔ ہمیں بتائے بغیر گھر سے فرار ہو گیا ہے۔ اس کی مدد کرنا۔“ میں اسی طرح خاموش کھڑا رہا تو پاٹ دار آواز میں بولے۔ ”میاں اندر آ جاؤ، کیا چپ کا روزہ رکھا ہے؟“ میں ذرا آگے بڑھا تو بھی میری طرف نہ دیکھا اور ویسے ہی عروسِ نو کی طرح بیٹھے رہے۔ پھر

قدرے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "برخوردار بیٹھ جاؤ۔" مَیں وہیں بیٹھ گیا تو اپنے دوستوں سے فرمایا۔ "بھئی ذرا ٹھہرو، مجھے اس سے دو دو ہاتھ کر لینے دو۔" پھر حکم ہُوا۔ "بتاؤ ہندسہ کا کون سا مسئلہ تمہاری سمجھ میں نہیں آیا؟" میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا تو انہوں نے اسی طرح کندھوں کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائے اور آہستہ آہستہ کُرتہ یوں اوپر کھینچ لیا کہ ان کی کمر برہنہ ہو گئی۔ پھر فرمایا "بناؤ اپنی انگلی سے میری کمر پر متساوی الساقین۔" مجھ پر سکتہ کا عالم طاری تھا، نہ آگے بڑھنے کی ہمت تھی۔ نہ پیچھے ہٹنے کی طاقت۔ ایک لمحہ کے بعد بولے۔ "میاں جلدی کرو، نابینا ہوں، کاغذ قلم کچھ نہیں سمجھتا۔" میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور ان کی چوڑی چکلی کمر پر کانپتے ہوئے انگلی سے متساوی الساقین بنانے لگا۔ جب وہ غیر مرئی شکل بن چکی تو بولے۔ "اب نقطہ س سے خط ب ج پر عمود گراؤ۔" ایک تو مَیں گھبرایا ہوا تھا، دوسرے وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ یونہی انکل سے میں نے ایک مقام پر انگلی رکھ کر عمود گرانا چاہا تو تیزی سے بولے "ہے ہے، کیا کرتے ہو۔ یہ نقطہ س ہے کیا؟" پھر خود ہی بولے۔ "آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گے۔ بائیں کندھے سے کوئی چھ انگل نیچے نقطہ س ہے۔ وہاں سے خط کھینچو——" اللہ اکبر اللہ اکبر۔ کیا علم تھا، کیا آواز تھی اور کیسی تیز فہم تھی۔ وہ بول رہے تھے اور مَیں مبہوت بیٹھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ابھی ان کے آخری جملے کے ساتھ نور کی لکیریں متساوی الساقین بن کر ان کی کمر پُر ابھر آئیں گی۔ پھر داؤ جی دلّی کے دنوں میں ڈوب گئے۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ میری طرف دیکھ رہے تھے لیکن مجھے نہیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "پھر کیا ہوا داؤ جی؟" انہوں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "رات بہت گزر چکی ہے، اب تو سو جا، پھر بتاؤں گا۔" مَیں ضدی بچّے کی طرح ان کے پیچھے پڑ گیا تو انہوں نے کہا۔ "پہلے وعدہ کر کہ آئندہ مایوس نہیں ہوگا اور ان چھوٹی چھوٹی پراپوزیشنوں کو بتاشے سمجھے گا۔" میں نے جواب دیا۔ "حلوا سمجھوں گا، آپ فکر نہ کریں۔" انہوں نے کھڑے کھڑے کمبل لپیٹتے ہوئے کہا۔ "بس مختصر یہ کہ میں ایک سال حکیم صاحب کی حضوری میں رہا اور اس بحرِ علم سے چند قطرے حاصل کر کے اپنی کور آنکھوں کو دھویا۔ واپسی پر مَیں سیدھا اپنے آقا کی خدمت میں پہنچا اور ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔" فرمانے لگے۔ "چنت رام! اگر ہم میں قوت ہو تو ان پاؤں کو کھینچ

لیں۔" اس پر مَیں رو دیا تو دستِ محبت میرے سر پر پھیر کر کہنے لگے۔ "ہم تم سے ناراض نہیں ہیں لیکن ایک سال کی فرقت بہت طویل ہے۔ آئندہ کہیں جانا تو ہمیں بھی ساتھ لے جانا۔" یہ کہتے ہوئے داؤ جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ مجھے اسی طرح گُم سُم چھوڑ کر بیٹھک سے باہر نکل گئے۔

امتحان کی قربت سے میرا خون خشک ہو رہا تھا لیکن جسم پھول رہا تھا۔ داؤ جی کو میرے موٹاپے کی فکر رہنے لگی۔ اکثر میرے تھن متھنے ہاتھ پکڑ کر کہتے۔ "اسپ تازی بن طویلۂ خر نہ بن۔" مجھے ان کا یہ فقرہ بہت ناگوار گزرتا اور میں احتجاجاً ان سے کلام بند کر دیتا۔ میرے مسلسل مرن برت نے بھی ان پر کوئی اثر نہ کیا اور ان کی فکر اندیشہ کی حد تک پہنچ گئی۔ ایک صبح سیر کو جانے سے پہلے انہوں نے مجھے آ جگایا اور میری منتوں، خوشامدوں، گالیوں اور جھڑکیوں کے باوجود بستر سے اٹھا، کوٹ پہنا کر کھڑا کر دیا، پھر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر گویا گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ سردیوں کی صبح کوئی چار کا عمل۔ گلی میں نہ آدم نہ آدم زاد، تاریکی سے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا اور داؤ جی مجھے اسی طرح سیر کو لے جا رہے تھے۔ میں کچھ بک رہا تھا اور وہ کہہ رہے تھے۔ "ابھی گراں خوابی دور نہیں ہوئی، ابھی طنبورہ بڑبڑا رہا ہے۔" تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کہتے۔ "کوئی سُر نکال طنبورے، کسی آہنگ پر بج، یہ کیا کر رہا ہے؟" جب ہم بستی سے بہت دور نکل گئے اور صبح کی یخ ہوا نے میری آنکھوں کو زبردستی کھول دیا تو داؤ جی نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ سرداروں کا رہٹ آیا اور نکل گیا۔ ندی آئی اور پیچھے رہ گئی۔ قبرستان گزر گیا مگر داؤ جی تھے کہ کچھ آیتیں سی پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ جب تھیہ پر پہنچے تو میری روح فنا ہو گئی۔ یہاں سے لوگ دوپہر کے وقت بھی نہ گزرتے تھے کیونکہ پرانے زمانے میں یہاں ایک شہر غرق ہوا تھا۔ مرنے والوں کی روحیں اس ٹیلے پر رہتی تھیں اور آنے جانے والوں کا کلیجہ چبا جاتی تھیں۔ میں خوف سے کانپنے لگا تو داؤ جی نے میرے گلے کے گرد مفلر اچھی طرح لپیٹ کر کہا۔ کہ سامنے ان دو کیکروں کے درمیان اپنی پوری رفتار سے دس چکر لگاؤ، پھر سو لمبی سانسیں کھینچو اور چھوڑو، تب میرے پاس آؤ۔ میں یہاں بیٹھتا ہوں۔ میں تھیہ سے جان بچانے کے لیے سیدھا ان کیکروں کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہلے ایک بڑے ڈھیلے پر بیٹھ کر آرام کیا اور ساتھ ہی

حساب لگایا کہ چھ چکروں کا وقت گزر چکا ہوگا، اس کے بعد آہستہ آہستہ اونٹ کی طرح کیکروں کے درمیان دوڑنے لگا اور جب دس یعنی چار چکر پورے ہو گئے تو پھر اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں کھینچنے لگا۔ ایک تو درختوں پر عجیب و غریب قسم کے جانور بولنے لگے تھے۔ دوسرے میری پسلی میں بلا کا درد شروع ہو گیا تھا۔ یہی مناسب سمجھا کہ تھیہ پر جا کر داؤجی کو سوئے ہوئے کو اٹھاؤں اور گھر لے جا کر خوب خاطر کروں۔ غصہ سے بھرا اور دہشت سے لرزتا میں ٹیلے کے پاس پہنچا۔ داؤجی تھیہ کی ٹھیکریوں پر گھٹنوں کے بل گرے ہوئے دیوانوں کی طرح سر مار رہے تھے اور اونچے اونچے اپنا محبوب شعر گا رہے تھے

جفا کم کن کہ فردا روزِ محشر
بہ پیشِ عاشقاں شرمندہ باشی!

کبھی دونوں ہتھیلیاں زور سے زمین پر مارتے اور سر اوپر اٹھا کر انگشتِ شہادت فضا میں یوں ہلاتے جیسے کوئی ان کے سامنے کھڑا ہو اور اس سے کہہ رہے ہوں، دیکھ لو، سوچ لو۔ میں تمہیں —— مَیں تمہیں بتا رہا ہوں —— سنا رہا ہوں —— ایک دھمکی دیئے جاتے تھے۔ پھر تڑپ کر ٹھیکریوں پر گرتے اور جفا کم کُن جفا کم کُن کہتے ہوئے رونے سے لگتے۔ تھوڑی دیر میں ساکت و جامد وہاں کھڑا رہا اور پھر زور سے چیخ مار کر بجائے قصبہ کی طرف بھاگنے کے پھر کیکروں کی طرف دوڑ گیا۔ داؤجی ضرور اسمِ اعظم جانتے تھے اور وہ جنّ قابو کر رہے تھے۔ مَیں نے اپنی آنکھوں سے ایک جنّ ان کے سامنے کھڑا دیکھا تھا۔ بالکل الف لیلہ، باتصویر والا جنّ تھا۔ جب داؤجی کا طلسم اس پر نہ چل سکا تو اس نے انہیں نیچے گرا لیا تھا۔ وہ چیخ رہے تھے۔ جفا کم کُن جفا کم کُن مگر وہ چھوڑتا نہیں تھا۔ میں اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر رونے لگا —— تھوڑی دیر بعد داؤجی آئے۔ انہوں نے پہلے جیسا چہرہ بنا کر کہا۔ "چل طنبورے" اور مَیں ڈرتا ڈرتا ان کے پیچھے ہو لیا۔ راستہ میں انہوں نے گلے میں لٹکتی ہوئی کھلی پگڑی کے دونوں کونے ہاتھ میں پکڑ لیے اور جھوم جھوم کر گانے لگے۔

تیرے لمے لمے وال فریدا ٹریا ٹریا جا!

اس جادوگر کے پیچھے چلتے ہوئے مَیں نے ان آنکھوں سے واقعی انہیں دیکھا

کہ اس کا سر تبدیل ہو گیا۔ اس کی لمبی لمبی زلفیں کندھوں پر جھولنے لگیں اور اس کا سارا وجود جٹا دھاری ہو گیا —— اس کے بعد چاہے کوئی میری بوٹی بوٹی اڑا دیتا، میں ان کے ساتھ سیر کو نہ گیا۔

اس واقعہ کے چند ہی دن بعد کا قصہ ہے کہ ہمارے گھر میں مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلے اور اینٹوں کے ٹکڑے آ کر گرنے لگے۔ بے بے نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ بچوں والی کتیا کی طرح داؤجی سے چمٹ گئی۔ سچ مچ ان سے لپٹ گئی اور انہیں دھکا دے کر زمین پر گرا دیا۔ وہ چلّا رہی تھیں۔ "بڈھے ٹونگی! یہ سب تیرے منتر ہیں۔ یہ سب تیری فارسی ہے۔ تیرا کالا علم ہے جو الٹا ہمارے سر پر آ گیا ہے۔ تیرے پریت میرے گھر میں اینٹیں پھینکتے ہیں، اجاڑ مانگتے ہیں، موت چاہتے ہیں۔" پھر وہ زور زور سے چیخنے لگی۔ "مَیں مر گئی، مَیں جل گئی لوگو۔ اس بڈھے نے میرے امی چند کی جان لینے کا پربندھ کیا ہے۔ مجھ پر جادو کیا ہے۔ میرا انگ انگ توڑ دیا ہے۔" امی چند تو داؤجی کو اپنی زندگی کی طرح عزیز تھا اور اس کی جان کے دشمن بھلا وہ کیونکر ہو سکتے تھے لیکن چنو کی خشت باری انہیں کی وجہ سے عمل میں آئی تھی۔ جب مَیں نے بھی بے بے کی تائید کی تو داؤجی نے زندگی میں پہلی بار مجھے جھڑک کر کہا۔ "تو احمق ہے اور تیری بے بے اُمّ الجاہلین —— میری ایک سال کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ تو جنوں بھوتوں میں اعتقاد کرنے لگا۔ افسوس تو نے مجھے مایوس کر دیا۔ اے وائے کہ تو شعور کے بجائے عورتوں کے اعتقاد کا غلام نکلا۔ افسوس —— صد افسوس" بے بے کو اسی طرح چلّاتے اور داؤجی کو یوں کراہتے چھوڑ کر میں اوپر کوٹھے پر دھوپ میں جا بیٹھا —— اسی دن شام کو جب میں اپنے گھر سے آ رہا تھا تو راستہ میں رانو نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھ کانی کر کے پوچھا۔ "سنا بابو تیرے تو کوئی اینٹ ڈھیلا تو نہیں لگا؟ سنا ہے تمہارے پنڈت کے گھر میں روڑے گرتے ہیں۔" "مَیں نے اس کمینے کے منہ لگنا پسند نہ کیا اور چپ چاپ ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ رات کے وقت داؤجی مجھ سے جیومیٹری کی پراپوزیشنیں سنتے ہوئے پوچھنے لگے۔ "بیٹا کیا تم سچ مچ جن بھوت یا پری چڑیل کو کوئی مخلوق سمجھتے ہو؟" میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ ہنس پڑے اور بولے۔ "واقعی تو بہت بھولا ہے۔ میں نے آج خواہ مخواہ تجھے جھڑک دیا۔ بھلا تو نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ جن ہوتے ہیں اور اس طرح اینٹیں پھینک سکتے ہیں۔ ہم

نے جو ولی مستری اور پھتّے مزدور کو لگا کر برساتی بنوائی ہے، وہ تیرے کسی جنّ کو کہہ کر بنوا لیتے لیکن یہ بتا کہ جن صرف اینٹیں پھینکنے ہی کا کام کرتے ہیں کہ چنائی بھی جانتے ہیں؟" مَیں نے جل کر کہا۔ "جتنے مذاق چاہو کر لو مگر جس دن سر پھٹے گا، اس دن پتہ چلے گا داؤ۔" داؤجی نے کہا۔ "تیرے جن کی پھینکی ہوئی اینٹ سے تو تا قیامت سر نہیں پھٹ سکتا، اس لیے کہ نہ وہ ہے نہ اس سے اینٹ اٹھائی جا سکے گی اور نہ میرے تیرے یا تیری بے بے کے سر میں لگے گی۔"

پھر بولے۔ "سُن! علم طبعی کا موٹا اصول ہے کہ کوئی مادی شے کسی غیر مادی وجود سے حرکت میں نہیں لائی جا سکتی —— سمجھ گیا؟"

"سمجھ گیا؟" مَیں نے چڑ کر کہا۔

ہمارے قصبہ میں ہائی سکول ضرور تھا لیکن میٹرک کے امتحان کا سنٹر نہ تھا۔ امتحان دینے کے لیے ہمیں ضلع جانا ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ صبح آ گئی جب ہماری جماعت امتحان دینے کے لیے ضلع جا رہی تھی اور لاری کے ارد گرد والدین قسم کے لوگوں کا ایک ہجوم تھا اور اس ہجوم سے داؤجی کیسے پیچھے رہ سکتے تھے اور سب لڑکوں کے گھر والے انہیں خیر و برکت کی دعاؤں سے نواز رہے تھے اور داؤجی سارے سال کی پڑھائی کا خلاصہ تیار کر کے جلدی جلدی سوال پوچھ رہے تھے اور میرے ساتھ ساتھ خود ہی جواب دیتے جاتے تھے۔ اکبر کی اصلاحات سے اُچھل کر موسم کے تغیّر و تبدل پر پہنچ جاتے۔ وہاں سے پلٹتے تو "اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا کہ اپنی وضع سے ہندو معلوم ہوتا تھا۔ وہ نشہ میں چُور تھا۔ ایک عورت ——"

"جہانگیر۔" مَیں نے جواب دیا۔ "اور وہ عورت؟" "نور جہاں۔" ہم دونوں ایک ساتھ بولے —— "صفت مشبہ اور اسم فاعل میں فرق؟" مَیں نے دونوں کی تعریفیں بیان کیں۔ بولے "مثالیں؟" میں نے مثالیں دیں۔ سب لڑکے لاری میں بیٹھ گئے اور مَیں ان سے جان چھڑا کر جلدی سے داخل ہوا تو گھوم کر کھڑکی کے پاس آ گئے اور پوچھنے لگے۔ بریک ان اور بریک اِن ٹو کو فقروں میں استعمال کرو۔ ان کا استعمال بھی ہو گیا اور موٹر سٹارٹ ہو کر چلی تو اس کے ساتھ ساتھ قدم اٹھا کر بولے۔ "طنبورے مادیاں گھوڑی ماکیاں مرغی —— مادیاں گھوڑی —— ماکیاں —— مرغی —— ایک سال بعد خدا

خدا کر کے یہ آواز دور ہوئی اور میں نے آزادی کا سانس لیا۔"

پہلے دن تاریخ کا پرچہ بہت اچھا ہوا۔ دوسرے دن جغرافیہ کا اس سے بڑھ کر۔ تیسرے دن اتوار تھا اور اس کے بعد حساب کی باری تھی۔ اتوار کی صبح داؤجی کا کئی صفحہ لمبا خط ملا جس میں الجبرے کے فارمولوں اور حساب کے قاعدوں کے علاوہ کوئی اور بات نہ تھی۔

حساب کا پرچہ کرنے کے بعد برآمدے میں مَیں نے لڑکوں سے جوابات ملائے تو سو میں سے اسّی نمبر کا پرچہ ٹھیک تھا۔ میں خوشی سے پاگل ہو گیا۔ زمین پر پاؤں نہ پڑتا تھا اور میرے منہ سے مسرت کے نعرے نکل رہے تھے۔ جونہی میں نے برآمدے سے پاؤں باہر رکھا، داؤجی کھیس کندھے پر ڈالے ایک لڑکے کا پرچہ دیکھ رہے تھے۔ میں چیخ مار کر ان سے لپٹ گیا اور "اسّی نمبر! اسّی نمبر" کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ انہوں نے پرچہ میرے ہاتھ سے چھین کر تلخی سے پوچھا۔ "کون سا سوال غلط ہو گیا؟" میں نے جھوم کر کہا۔ "چار دیواری والا۔" جھلّا کر بولے۔ "تو نے کھڑکیاں اور دروازے منفی نہیں کیے ہوں گے۔" مَیں نے ان کی کمر پر ہاتھ ڈال کر پیڑ کی طرح جھلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں جی ہاں جی —— گولی مارو کھڑکیوں کو۔" داؤجی ڈوبی ہوئی آواز میں بولے۔ "تُو نے مجھے برباد کر دیا طنبورے۔ سال کے تین سو پینسٹھ دن میں پکار پکار کر کہتا رہا۔ مسطحات کا سوال آنکھیں کھول کر حل کرنا مگر تُو نے میری بات نہ مانی۔ تُو نے میری بات نہ مانی۔ بیس نمبر ضائع کیے —— پورے بیس نمبر۔" اور داؤجی کا چہرہ دیکھ کر میری اسّی فیصدی کامیابی بیس فیصدی ناکامی کے نیچے یوں دب گئی گویا اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ راستہ بھر وہ اپنے آپ سے کہتے رہے۔ "اگر ممتحن اچھے دل کا ہوا تو وہ ایک نمبر ضرور دے گا۔ تیرا باقی حل تو ٹھیک ہے۔" اس پرچے کے بعد داؤجی امتحان کے آخری دن تک میرے ساتھ رہے۔ وہ رات کے بارہ بجے تک مجھے اس سرائے میں بیٹھ کر پڑھاتے جہاں ہماری کلاس مقیم تھی اور اس کے بعد بقول ان کے اپنے ایک دوست کے یہاں چلے جاتے۔ صبح آٹھ بجے پھر آ جاتے اور کمرۂ امتحان تک میرے ساتھ چلتے۔

امتحان ختم ہوتے ہی میں نے داؤجی کو یوں چھوڑ دیا گویا میری ان سے جان پہچان ہی نہ تھی۔ سارا دن دوستوں یاروں کے ساتھ گھومتا اور شام کو ناولیں پڑھتا

کرتا۔ اس دوران میں اگر کبھی فرصت ملتی تو داؤجی کو سلام کرنے بھی چلا جاتا۔ وہ اس بات پر مُصر تھے کہ مَیں ہر روز کم از کم ایک گھنٹہ ان کے ساتھ گزارا کروں تاکہ وہ مجھے کالج کی پڑھائی کے لیے بھی تیار کر دیں لیکن میں ان کے پھندے میں آنے والا نہ تھا۔ مجھے کالج میں سو بار فیل ہونا گوارا تھا اور ہے لیکن داؤجی سے پڑھنا منظور نہیں۔ پڑھنے کو چھوڑیئے، ان سے باتیں کرنا بھی مشکل تھا۔ میں نے کچھ پوچھا، انہوں نے کہا، اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔ میں نے کچھ جواب دیا، فرمایا اس کی ترکیب نحوی کرو۔ حوالداروں کی گائے اندر گھس آئی، میں اسے لکڑی سے باہر نکال رہا ہوں اور داؤجی پوچھ رہے ہیں Cow ناؤن ہے یا ورب۔ اب ہر عقل کا اندھا پانچویں جماعت تک پڑھا جانتا ہے کہ گائے اسم ہے مگر داؤجی فرما رہے ہیں کہ اسم بھی ہے اور فعل بھی۔ To Cow کا مطلب ہے ڈرانا، دھمکی دینا اور یہ ان دنوں کی باتیں ہیں جب میں امتحان سے فارغ ہو کر نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا۔۔۔ پھر ایک دن وہ بھی آیا جب ہم چند دوست شکار کھیلنے کے لیے نکلے تو مَیں نے ان سے درخواست کی کہ منصفی سے آگے نہ جائیں کیونکہ وہاں داؤجی ہوں گے اور مجھے روک کر شکار بندوق اور کارتوسوں کے محاورے پوچھنے لگیں گے۔ بازار میں دکھائی دے جاتے تو میں کسی بغلی گلی میں گھس جاتا۔ گھر پر رسماً ملنے جاتا تو بے بے سے زیادہ اور داؤجی سے کم باتیں کرتا۔ اکثر کہا کرتے "افسوس آفتاب کی طرح تو بھی ہمیں فراموش کر رہا ہے۔" مَیں شرارتاً خیلے خوب خیلے خوب کہہ کر ہنسنے لگتا۔

جس دن نتیجہ نکلا اور اباجی لڈوؤں کی ایک چھوٹی سی ٹوکری لے کر ان کے گھر گئے۔ داؤجی سر جھکائے اپنے حصیر پر بیٹھے تھے۔ اباجی کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اندر سے کرسی اٹھا لائے اور اپنے بوریے کے پاس ڈال کر بولے۔ "ڈاکٹر صاحب آپ کے سامنے شرمندہ ہوں لیکن اسے بھی مقسوم کی خوبی سمجھئے۔ میرا خیال تھا کہ اس کی فرسٹ ڈویژن آجائے گی لیکن نہ آسکی۔ بنیاد کمزور تھی۔۔۔"

"ایک ہی تو نمبر کم ہے۔" مَیں نے چہک کر بات کاٹی۔

اور وہ میری طرف دیکھ کر بولے۔ "تو نہیں جانتا، اس ایک نمبر سے میرا دل دو نیم ہو گیا ہے۔ خیر میں اسے منجانب اللہ خیال کرتا ہوں۔"

پھر اباجی اور وہ باتیں کرنے لگے اور میں بے بے کے ساتھ گپیں لڑانے میں مشغول ہو گیا۔

اوّل اوّل کالج سے میں داؤجی کے خطوں کا باقاعدہ جواب دیتا رہا۔ اس کے بعد بے قاعدگی سے لکھنے لگا اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

چھٹیوں میں جب گھر آتا تو جیسے سکول کے دیگر ماسٹروں سے ملتا، ویسے ہی داؤجی کو بھی سلام کرتا۔ اب وہ مجھ سے سوال وغیرہ نہ پوچھتے تھے۔ کوٹ پتلون اور ٹائی دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ چارپائی پر بیٹھنے نہ دیتے تھے۔ کہا کرتے اگر مجھے اٹھانے نہیں دیتا تو خود کرسی لے لے اور میں کرسی کھینچ کر ان کے پاس ڈٹ جاتا۔ کالج لائبریری سے جو کتابیں ساتھ لایا کرتا، انہیں دیکھنے کی تمنا ضرور کرتے اور میرے وعدے کے باوجود اگلے دن خود ہمارے گھر آکر کتابیں دیکھ جاتے۔ امی چند بوجوہ کالج چھوڑ کر بینک میں ملازم ہو گیا تھا اور دلّی چلا گیا تھا۔ بے بے کی سلائی کا کام بدستور تھا۔ داؤجی بھی منصفی جاتے تھے لیکن کچھ نہ لاتے تھے۔ بی بی کے خط آتے تھے اور وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔۔۔ کالج کی ایک سال کی زندگی نے مجھے داؤجی سے بہت دور کھینچ لیا۔ وہ لڑکیاں جو دو سال پہلے ہمارے ساتھ آپوٹاپو کھیلا کرتی تھیں، بنتِ عم بن گئی تھیں۔ سیکنڈ ایئر کے زمانے کی ہر چھٹی مَیں آپوٹاپو میں گزارنے کی کوشش کرتا اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوتا۔ گھر کی مختصر مسافت کے سامنے ایبٹ آباد کا طویل سفر زیادہ تسکین دہ اور سہانا بن گیا۔ انہی ایام میں مَیں نے پہلی مرتبہ ایک خوبصورت گلابی پیڈ اور ایسے ہی لفافوں کا ایک پیکٹ خریدا تھا اور ان پر نہ اباجی کو خط لکھے جاسکتے تھے اور نہ ہی داؤجی کو۔۔۔ نہ دسہرے کی چھٹیوں میں داؤجی سے ملاقات ہو سکی، نہ کرسمس کی تعطیلات میں۔ ایسے ہی گزر گیا اور یوں ہی ایام گزرتے رہے۔

۔۔۔ ملک کو آزادی ملنے لگی تو کچھ بلوے ہوئے۔ پھر لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ ہر طرف سے فسادات کی خبریں آنے لگیں اور اماں نے ہم سب کو گھر بلوا لیا۔ ہمارے لیے یہ جگہ بہت محفوظ تھی۔ بنیے ساہوکار گھربار چھوڑ کر بھاگ رہے تھے لیکن دوسرے لوگ خاموش تھے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہی لوگ یہ خبر لائے کہ آزادی مل گئی! ایک دن ہمارے قصبہ میں بھی چند گھروں کو آگ

لگی اور دوناکوں پر سخت لڑائی ہوئی۔ تھانے والوں اور ملٹری کے سپاہیوں نے کرفیو لگا دیا اور جب کرفیو ختم ہوا تو سب ہندو سکھ قصبہ چھوڑ کر چل دیئے۔ دوپہر کو اماں نے مجھے داؤجی کی خبر لینے کو بھیجا تو اس جانی پہچانی گلی میں عجیب و غریب اجنبی صورتیں نظر آئیں۔ ہمارے گھر یعنی داؤجی کے گھر کی ڈیوڑھی میں ایک بیل بندھا تھا اور اس کے پیچھے بوری کا پردہ لٹک رہا تھا۔ مَیں نے گھر آکر بتایا کہ داؤجی اور بے بے اپنا گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور اب لوٹ کر نہ آئیں گے۔ داؤجی ایسے بے وفا نہ تھے!— کوئی تیسرے روز غروب آفتاب کے بہت بعد جب میں مسجد میں نئے پناہ گزینوں کے نام نوٹ کر کے اور کمبل بھجوانے کا وعدہ کر کے اس گلی سے گزرا تو کھلے میدان میں سو دو سو آدمیوں کی بھیڑ دیکھی۔ مہاجر لڑکے لاٹھیاں پکڑے نعرے لگا رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔ میں نے تماشائیوں کو پھاڑ کر مرکز گھسنے کی کوشش کی مگر مہاجرین کی خونخوار آنکھیں دیکھ کر سہم گیا۔ ایک لڑکا کسی بزرگ سے کہہ رہا تھا۔ "ساتھ کے گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ جب لوٹا تو اپنے گھر میں گھستا چلا گیا۔"

"کون سے گھر میں؟" بزرگ نے پوچھا۔

"رہتکی مہاجروں کے گھر میں۔" لڑکے نے کہا۔

"پھر؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"پھر کیا؟ انہوں نے پکڑ لیا۔ دیکھا تو ہندو نکلا۔"

اتنے میں اس بھیڑ سے کسی نے چلّا کر کہا۔ "اوئے رانو جلدی آ۔ اوئے جلدی آ— تیری سامی— پنڈت— تیری سامی۔"

رانو بکریوں کا ریوڑ باڑے کی طرف لے جا رہا تھا۔ انہیں روک کر اور ایک لاٹھی والے لڑکے کو ان کے آگے کھڑا کر کے وہ بھیڑ میں گھس گیا۔ میرے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ جیسے انہوں نے داؤجی کو پکڑ لیا ہو۔ میں نے ملزم کو دیکھے بغیر اپنے قریبی لوگوں سے کہا۔ "یہ بڑا اچھا آدمی ہے۔ بڑا نیک آدمی ہے— اسے کچھ مت کہو— یہ تو— یہ تو—" خون میں نہائی ہوئی چند آنکھوں نے میری طرف دیکھا اور ایک نوجوان گنڈاسی تول کر بولا۔

"بتاؤں تجھے بھی!— آگیا بڑا حمایتی بن کر— تیرے ساتھ کچھ ہُوا نہیں

نا۔" اور لوگوں نے گالیاں بک کر کہا۔ "انصار ہو گا شاید۔"

مَیں ڈر کر دوسری جانب بھیڑ میں گھس گیا۔ رانو کی قیادت میں اس کے دوست داؤجی کو گھیرے کھڑے تھے اور رانو، داؤجی کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا۔ "اب بول بیٹا اب بول۔" اور داؤجی خاموش کھڑے تھے۔ ایک لڑکے نے ان کی پگڑی اتار کر کہا۔ "پہلے بودی کاٹو بودی۔" اور رانوں نے مسواکیں کاٹنے والی درانتی سے داؤجی کی بودی کاٹ دی، وہی لڑکا پھر بولا۔ "بلاویں جے؟" اور رانو نے کہا۔ "جانے دو بڈھا ہے میرے ساتھ بکریاں چرایا کرے گا۔" پھر اس نے داؤجی کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "کلمہ پڑھ پنڈتا۔" اور داؤجی آہستہ سے بولے۔

"کونسا؟"

رانو نے ان کے ننگے سر پر ایسا تھپڑ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچے اور بولا۔

"سالے کلمے بھی کوئی پانچ سات ہیں!"

جب وہ کلمہ پڑھ چکے تو رانو نے اپنی لاٹھی ان کے ہاتھ میں تھما کر کہا۔ "چل بکریاں تیری انتظاری کرتی ہیں۔"

اور ننگے سر داؤجی بکریوں کے پیچھے یوں چلے جیسے لمبے لمبے بالوں والا فریدا چل رہا ہو!



گُل ٹریا

سردیوں کی ایک منجمد اور تاریک رات کو بھیّا نے میرا لحاف اٹھا کر مجھے جھنجھوڑا اور آہستہ سے کہا۔ "اُٹھو، ٹی ٹی آ گیا ہے۔" گرم گرم لحاف کی گود میں مَیں بڑے آرام سے سویا ہوا تھا اور اس وقت اگر کوئی مجھے اُٹھا کر سلیمانی ٹوپی دینے کا وعدہ بھی کرتا تو مَیں نہ اُٹھتا لیکن ٹی ٹی کا نام سُن کر میں چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور کوٹھڑی میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑانے لگا۔ کمرے میں دھونسی ہوئی چمنی والی لمبوتری لالٹین جل رہی تھی اور اس کے پاس بھیّا سر جھکائے سحری کھا رہے تھے۔ میں نے پاؤں چارپائی سے اتارتے ہوئے پوچھا۔ "کہاں ہے ٹی ٹی؟" تو انہوں نے اسی طرح سر جھکائے جواب دیا۔ "نیچے تو اترو، آنکھیں تو کھولو۔ سب کچھ آپ سے آپ نظر آ جائے گا۔"

میں نیچے اُترا۔ آنکھیں کھولیں، دھونسی ہوئی چمنی کے آگے ہاتھ کر کے بھیّا کو دیکھا مگر ٹی ٹی نظر نہ آیا۔ چارپائی کے نیچے ہم دونوں کا مشترکہ ٹرنک پڑا تھا۔ اس کے پاس بیٹ اور وکٹیں بکھری ہوئی تھیں اور ان سے ذرا فاصلے پر بستر سے گر جانے والی کتابیں اور کاپیاں اوندھی سیدھی لیٹی تھیں لیکن ٹی ٹی کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر ہولے سے پوچھا۔ "کہاں ہے بھیا؟" اور بھیّا اسی طرح سحری کھاتے رہے۔ انہوں نے دہی کا کٹورا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو سحری کھاؤ۔ صبح صبح چپکے چپکے روزہ رکھ لینا، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔"

بچپن میں ہر چھوٹے بچے کی طرح مجھے بھی روزہ رکھنے کی بڑی تمنّا ہوا کرتی تھی لیکن گھر والے سحری کے وقت جگاتے نہیں تھے۔ بھیا سے کئی مرتبہ درخواست کی تھی، پر وہ بھی گھر والوں کا ساتھ دیتے رہے۔ ہر صبح میں اٹھتے ہی ان سے خوب جھگڑتا،

گالیاں سناتا اور بد دعائیں دیتا۔ اس پر بھی وہ برہم نہ ہوتے اور مسکرانے لگتے تو انہیں بجو بجو کہہ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرتا لیکن وہ اسی طرح مسکراتے رہتے اور میرا روزہ جوں کا توں رہ جاتا۔

آج انہوں نے کمال مہربانی سے مجھے اپنے آپ اٹھا دیا تھا اور اپنی سحری پر دعوت دے رہے تھے لیکن ٹی ٹی کا نام سن کر سحری کھانے اور روزہ رکھنے میں لطف نہ رہا تھا۔ میری نگاہیں چاروں طرف اسے ڈھونڈ رہی تھیں اور میرا جی اس سے لپٹ کر پیار کرنے کو چاہتا تھا۔ اگر بھیّا سے بار بار پوچھتا تو وہ یقیناً مجھے ستاتے، مجھے اس کے پاس نہ لے جاتے اور وہ رات اسے دیکھے بغیر گزر جاتی۔ میں نے جلدی جلدی سحری کھانا شروع کر دی اور بھیا سے پہلے فارغ ہو گیا۔ پراٹھوں سے ہاتھ چکنے ہو گئے تھے۔ وہ مَیں نے قمیص سے پونچھے اور بوٹیوں کے ریشے جو دانتوں میں پھنس گئے، انہیں ایسے ہی رہنے دیا۔ بھیا نے بڑے اطمینان سے سحری ختم کی۔ گرم پانی سے ہاتھ دھوئے۔ منجن سے دانت صاف کیے اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے مخلصانہ رائے دیتے ہوئے کہا۔ "ٹی ٹی کو دیکھنے چلیں؟" تو وہ ہنس پڑے اور دیر تک کرسی پر آگے پیچھے جھولنے کے بعد بولے۔ "میں تو یونہی کہہ رہا تھا۔ ایسی اندھیری رات میں بھلا کون اسے لاتا اور کس طرح ہمارے یہاں پہنچاتا۔"

یہ بات سُن کر میں جھلّا گیا اور مُکّا تان کر بولا۔ "بجو بکواسی، مجھے اٹھایا کیوں تھا پھر؟" بھیا اسی طرح جھولتے رہے۔ میں ان کی اس حرکت پر باؤلے کتّے کی طرح جھپٹا اور انہیں گردن سے پکڑ کر جھٹکے دینے لگا۔ وہ ہنستے رہے اور اپنا آپ چھڑاتے رہے۔ میں نے ان کے بال پکڑ کر سر کو زور زور سے جھکورے دیئے تو ان کے آنسو نکل آئے اور وہ اسی طرح ہنستے ہوئے گانے لگے۔ "اک لڑکے کو بہکایا تھا اور اونٹوں ساتھ لگایا تھا۔" مَیں اس بدتمیزی کی تاب نہ لا سکا۔ ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر کے بالوں کو اس زور سے کھینچا کہ وہ کرسی سے اٹھ کر کبڑے کبڑے ہو گئے اور ان کی ہنسی خود بخود معدوم ہو گئی۔ انہوں نے میری کلائیاں پکڑ کر ہاتھ چھڑواتے ہوئے کہا۔ "آؤ!"

کچّا صحن گزر کر ہم برآمدے سے ہوتے ہوئے بھوسے والی کوٹھڑی کے پاس جا نکلے۔ بھیا نے لیمپ دہلیز پر رکھ کر کواڑ کھولے۔ اندر سے گرم گرم بھوسے کا ایک بھبکا

آیا اور باہر کی خنک فضا شیر گرم سی ہو گئی۔ بھیا نے لالٹین اٹھا کر ہولے سے سیٹی بجائی اور دروازے کی اوٹ سے سفید رنگ کا ایک موٹا تازہ کتا برآمد ہوا۔ اس کی آنکھیں کنچوں کی طرح چمک رہی تھیں اور اس کے کان اٹھا سی کا ہندسہ بنے کھڑے تھے۔ اس نے تیز تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور دم ہلانے لگا۔

میں سب کچھ بھول گیا اور بھیا کا بازو ہلا کر پوچھنے لگا۔ "بھیا یہ گُل ٹریا ہے؟" بھیا نے محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور سر ہلا کر بولے۔ "دراصل یہ بُل ٹریئر ہے۔" مجھے ان کی یہ بات بالکل ناگوار نہ گزری اور میں جُھک کر ٹی ٹی کو دیکھنے لگا۔ اس کے گلے میں ریلوے بکنگ کی پرچی لٹک رہی تھی اور اس کی گردن اور چہرے سے بُھوسے کے بُہت سے تنکے چمٹے ہوئے تھے۔ مَیں نے بھیا کا ہاتھ پکڑ کر بڑے پیار سے ہلایا اور کہا۔ "صبح ہو گی تو ہم اسے سیر کرانے لے جائیں گے اور بیلے میں چھوڑ دیں گے۔ یہ ہمارے لیے خرگوش پکڑ کر لائے گا اور ہم ان سے کھیلا کریں گے۔" بھیا اسی طرح کھڑے میری باتیں سنتے رہے۔ پھر انہوں نے لالٹین اٹھا کر دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں صبح ہو گی تو ضرور چلیں گے، اب اسے سُونے دو۔"

بستر میں لیٹ کر مَیں جی ہی جی میں چچا اماں کا شکریہ ادا کرنے لگا جنہوں نے وعدے کے مطابق کوہاٹ جاتے ہی ٹی ٹی بھیج دیا تھا۔ جب تک وہ ہمارے یہاں رہے، روزانہ ٹی ٹی کے قصے سناتے رہے۔ اس کی ماں کی اچانک موت کا تذکرہ کرتے رہے اور اس کے بھائیوں کی بیہودگیوں اور گستاخیوں پر روشنی ڈالتے رہے۔ ہم ان کے پیچھے پڑ گئے کہ ٹی ٹی ہمیں بھجوا دیجیے۔ ہم سب بھائی بہن باری باری سے اپنی ایک وقت کی روٹی اسے ڈالتے رہیں گے۔ چچا تو مان گئے مگر اباجی نے اجازت نہ دی۔ وہ کہتے تھے کہ ہمارے گھر میں تو آدمیوں کو کوئی نہیں پوچھتا، کتے کا دھیان کون رکھے گا؟ ہم سب رونے لگے، ہاتھ جوڑے، منتیں کیں اور انہیں یقین دلایا کہ اگر ٹی ٹی کو کبھی کوئی تکلیف ہوئی تو وہ ہمیں گھر سے نکال دیں۔ اباجی کا دل پسیج گیا اور انہوں نے یہ شرط پیش کی کہ اگر بھیا اس کی غورو پرداخت کا ذمہ لیں تو البتہ وہ ٹی ٹی منگوانے کی اجازت دے سکتے ہیں۔ بھیا نے حامی بھرلی اور ہم اس وقت سے ہر گھڑی ٹی ٹی کا انتظار کرنے لگے۔

بھیا مجھ سے اتنے بڑے نہیں تھے۔ ہماری عمروں میں مشکل سے پانچ سال کا

فرق تھا لیکن چونکہ وہ ہم سب سے بڑے تھے، اس لیے میں اور میرے دونوں چھوٹے بھائی بہن انہیں بھیا کہا کرتے تھے۔ اس زمانے میں برسرِ اقتدار سیاسی جماعت نے اقلیتی فرقوں پر بڑے مظالم توڑنے شروع کر دیئے تھے اور ان دراز دستیوں کی لپیٹ میں ملک کی قومی زبان بھی آ گئی تھی۔ اردو کے حامیوں نے بلا لحاظ صوبہ و ریاست گھروں میں اردو بولنا شروع کر دی تھی اور یہ اسی سیاسی دباؤ کا اثر تھا کہ ہمارے گھر میں بڑے بھائی کو بھیا کہا جانے لگا۔ بھیا ہم سب بہن بھائیوں سے مختلف تھے۔ دبلے پتلے زردی مائل سفید رنگ کے بڑے خوش اطوار صاحبزادے تھے۔ بات بات میں لطیفے پیدا کرتے۔ قدم قدم پر نئی شرارتیں سجھاتے اور ہنسی ہنسی میں ہمیں پٹوا دیتے لیکن ان کے ارادے بُرے نہ تھے۔ خود ہی ہمیں بُھس میں چنگاری ڈالنے کے طریق بتاتے اور آپ ہی اسے بجھانے پر آمادہ ہو جاتے۔ اباجی سے پٹ پٹا کر ہم ان کی خوب مرمت کیا کرتے۔ وہ ہم سے خوب مار کھائے جاتے اور ہنستے رہتے۔ ہم نے کبھی انہیں منہ ٹھٹائے یا روتے نہ دیکھا تھا۔ نحیف الجثہ ہونے کے باوجود بڑے عزم کے آدمی تھے۔ جس بات کا ارادہ کر لیا، اسے پورا کر کے چھوڑا لیکن ان سب خوبیوں کے ساتھ ان میں ایک کمزوری بھی تھی۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار اور محتاط تھے۔ ان کی عقلمندی اور سمجھداری نے انہیں اباجی کا مشیر بنا دیا تھا اور اباجی ہر معاملے میں ان کا مشورہ طلب کرتے رہتے۔ اس مرتبہ بھی اگر وہ حامی نہ بھرتے تو اباجی ٹی ٹی منگوانے کی اجازت کبھی نہ دیتے۔

میں جی ہی جی میں چچا اماں کا شکریہ ادا کر رہا تھا اور بھیا دھونسی ہوئی چمنی والی لالٹین کے پاس پڑھنے میں مصروف تھے۔ کبھی کبھار وہ کتاب سے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھتے اور مَیں آنکھیں بند کر لیتا۔ پتہ نہیں ٹی ٹی کے بارے میں میں کب تک کیا کچھ سوچتا رہا کہ مجھے نیند آ گئی۔

اگلے دن صبح ہم دودھ میں مسلی ہوئی روٹی کا کٹورا بھر کر ٹی ٹی کے سامنے لے گئے اور اس کے ٹیبل مینرز کا نظارہ کرنے لگے۔ پل بھر میں اس نے کٹورا خالی کر دیا "اور کچھ اور ہے" جیسی نگاہوں سے ہمیں تکنے لگا۔ ہم نے اتنا سارا مواد لا کر اسے ڈالا اور چشم زدن میں وہ بھی ختم کر دیا گیا۔ بھیا نے اس کے جسم سے ایک ایک تنکا چنا اور اس کی پیٹھ تھپک کر بولے۔ "اچھا بھئی شام کو تمہاری اصل رہائش کا بندوبست کریں گے۔" پھر

انہوں نے کٹورا اٹھایا، نل کے نیچے جا کر دھویا اور پھر لا کر ٹی ٹی کے پاس رکھ دیا۔ اس دن ہم سب سکول ذرا دیر سے پہنچے اور جب تک چھٹی نہ ہو گئی، اپنے اپنے ڈسکوں پر نشست کے انداز بدلتے رہے۔ ہر ایک کے ذہن میں ٹی ٹی کی صورت گھوم رہی تھی۔ وہ لیٹا ہو گا اور اس کے کھچے ہوئے کان ڈھیلے پڑ گئے ہوں گے۔ وہ بیٹھا ہو گا اور زبان نکالے ہانپے جاتا ہو گا۔ وہ کھڑا ہو گا اور اس کی دم اِدھر اُدھر جھول رہی ہو گی۔ کسی نے بھی اپنا سبق دھیان سے نہ سنا اور چھٹی ملتے ہی اپنے اپنے کمروں سے سیدھے گھر کو بھاگے۔ بھیا وہاں پہلے سے بیٹھے تھے اور ٹی ٹی کے نیچے بوریاں بچھا رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ مل کر بوریاں ٹھیک کروانے لگا اور پہلی مرتبہ ٹی ٹی کو تھپک کر دیکھا۔

شام کے وقت ہم ٹی ٹی کو سیر کے لیے لے کر نکلے۔ بیلے میں جا کر ہم نے اسے کھلا چھوڑ دیا اور وہ جھاڑیوں میں ادھر ادھر سونگھ کر دیوانہ وار آگے پیچھے بھاگنے لگا۔ بھیا زنجیر گھماتے، زور کی سیٹی بجاتے، اس کا نام لے کر پکارتے اور وہ ہمارے پاؤں میں آ کر لوٹنے لگتا۔ تھوڑی دیر تک کُنس کونس کر کے آواز نکالتا اور پھر بھاگ جاتا۔

میں نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ ”بھیا اگر یہ ہم کو چھوڑ کر بھاگ گیا تو؟“

بھیا مسکرائے اور زمین پر زنجیر کی کنڈلی بٹھاتے ہوئے بولے ”کتا بڑا وفادار جانور ہے۔ اپنے مالک کو چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ نہیں جاتا اور اگر کوئی زبردستی لے جانا چاہے تو اس کو پھاڑ کھاتا ہے۔“

”اور اگر لے جانے والے کے پاس لاٹھی ہو تو؟“ مَیں نے پوچھا۔

بھیّا نے کہا۔ ”لاٹھی چھوڑ بندوق ہو، پھر بھی یہ اس کے ساتھ نہ جائے گا۔ یہ تو بس جس کے گھر رہتا ہے، اسی سے پیار کرتا ہے۔“

مَیں نے کہا۔ ”سارے کتّے ایسے ہوتے ہیں کہ صرف ٹُل ٹریا؟“

انہوں نے زنجیر سے کھیلتے ہوئے کہا۔ ”سارے!“

میرا جی چاہا ساری دنیا کے کتّوں کو گود میں اٹھا کر ان کا منہ چُوم لوں!

دوسرے روز عید تھی۔ رنگ برنگے کپڑوں کے چاؤ میں اور عیدی کی کھنک میں دن بھر ٹی ٹی کے پاس نہ جا سکا۔ بازار میں کباب اور پکوڑے کھاتا پھرا اور دوستوں کے ساتھ اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ شام کے وقت جب میں گھر گیا تو بھیا ٹی ٹی کو لے کر سیر

کے لیے نکل گئے تھے۔ تھوڑی دیر گھر بیٹھنے کے بعد مَیں پھر باہر نکل آیا۔ مجھے میٹھی گولیوں والی دکان یاد آ گئی تھی جہاں سیپ کے بٹنوں جتنی پیسے کی بتیس میٹھی گولیاں ملتی تھیں۔ دن بھر کی رقم میں سے صرف ایک آنہ باقی رہ گیا تھا اور میں تمام پونجی کا اکٹھا سٹاک خریدنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ قصبے سے باہر چنگی کے قریب صرف تیلو رام کی دکان پر ایسی گولیاں ملتی تھیں۔ میں جلدی جلدی قدم اٹھاتا اس کی دکان پر پہنچ گیا۔ اس کی دیگر گولیوں والی بوتل کی طرف اشارہ کیا اور خود سٹول پر بیٹھ گیا۔ ابھی اس نے ستر گولیاں ہی گنی تھیں کہ بھیا ٹی ٹی کی زنجیر ہاتھ میں لٹکائے دکان پر آ گئے۔ اس کے بال دھول میں اَٹے ہوئے تھے اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ انہوں نے میری کلائی پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ ”ٹی ٹی بھاگ گیا۔ میں نے بیلے میں لے جا کر زنجیر کھولی تو وہ ہوا ہو گیا۔“

میں سٹول سے بجلی کی سی تیزی سے اُچھلا اور تیلو رام کو گولیاں گنتے چھوڑ کر بھیّا کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ پہلے تو ہم تیز تیز قدم اٹھا کر چلے۔ پھر اچانک بھاگنے لگے۔ ہر راہگیر سے ٹی ٹی کے بارے میں پوچھا۔ اس کا جواب سنا اور پھر بھاگنا شروع کر دیا۔ بیلے میں پہنچ کر میں نے اور بھیّا نے زور زور سے آوازیں دیں، سیٹیاں بجائیں لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ ہم نے بیلے کا کونہ کونہ چھان مارا مگر ٹی ٹی کا پتہ نہ چلا۔ میں اور بھیا تھک ہار کر بیلے کی اونچی ڈھیری پر بیٹھ گئے اور میں نے ان کی طرف منہ کیے بغیر ہولے سے کہا۔ ”آپ نے اسے کُھلا ہی کیوں چھوڑا؟“

بھیا نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”کل بھی تو چھوڑا تھا، اس وقت تو نہ بھاگا۔ آج پتہ نہیں——“

مَیں نے بات کاٹ کر کہا۔ ”کل تو وہ نیا نیا آیا تھا، بیلے کا راستہ معلوم نہ تھا۔ بھاگتا کیسے؟“

بھیا نے کہا۔ ”وہ بھاگا نہیں، اسے کوئی پکڑ کر لے گیا ہے۔“

مَیں نے تنک کر کہا۔ ”کل تو آپ کہتے تھے کتّے کسی اور کے ساتھ جاتے نہیں اور کوئی لے جانے لگے تو اسے پھاڑ کھاتے ہیں۔“

بھیّا نے کہا۔ ”ہاں، میں اب بھی یہی کہتا ہوں۔ کوئی آدمی اس کا منہ باندھ کر لے گیا ہے۔ جونہی کھولے گا، ٹی ٹی اس کی گردن پکڑ لے گا۔“

میں نے سُنی اَن سُنی کر کے کہا "آپ کیا لگتے ہیں اس کے۔ چچا نے ہم چھوٹوں کے لیے بھیجا تھا۔ آپ خوامخواہ مالک بن کے بیٹھ گئے۔"

پھر مَیں بسورنے لگا۔ "آپ کو تو ہم ہی اچھے نہیں لگتے، ہمارا کتّا کیوں لگتا بھلا۔ آپ نے جان بوجھ کر اسے بھگا دیا ہے۔ آپ نے اپنے حصہ کی روٹی نہ دینے کے لیے اسے بھگایا ہے۔ آپ کے حصے کی — آپ کے — حصے کی روٹی — روٹی مَیں دے دیتا — مَیں —" پھر مَیں سسکیاں بھرنے لگا اور بھیا نے مجھے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ میں نے ان سے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا "ہمارا کتا گنوا کر ہم سے کیوں پیار کرتے ہیں آپ۔ جہاں ہمارا ٹی ٹی بھیجا ہے مجھے بھی وہیں بھیج دو۔ جس کے پاس اس کو بیچا ہے، مجھ کو بھی بیچ آؤ۔" پھر میں بھیا کی گرفت سے آزاد ہو کر ان کے پاؤں میں جھک گیا اور رو رو کر کہنے لگا۔ "لو چاہے جتنا مرضی مار لو، جتنا مرضی پیٹ لو۔ ٹی ٹی کو گنوا کر جی خوش نہیں ہوا تو مجھے پیٹ کر خوش ہو جاؤ — لو چاہے مجھے مار مار کر مار ہی ڈالو — چاہے — لو۔" مَیں ان کے پاؤں گھسیٹتا چلا گیا اور ایسے واہی تباہی بکتا رہا۔ بھیّا نے نہ تو میری کمر میں اپنا بازو ڈالا اور نہ میری ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر مجھے سہارا دیا۔ جب میں نے سر اٹھایا تو سامنے شیشم کی اونچی ڈالیوں پر نگاہیں گاڑے بیٹھے تھے اور ان کی آنکھوں سے موتیوں ایسے شفاف آنسو ڈھلک پڑے۔

اگلے دن سے ٹی ٹی کی باقاعدہ تلاش شروع ہو گئی۔ صبح سکول پہنچتے ہی ہم دونوں بھائی اپنے اپنے بستے ڈسک فیلوز کے سپرد کر دیتے اور ٹی ٹی کی تلاش میں نکل جاتے۔ بیلے کے ارد گرد تین تین چار چار میل کا رقبہ ہم نے انچ انچ چھان مارا۔ ہر راہ چلتے، ہل چلاتے، اونٹ لادے جانے والے سے ٹی ٹی کی بابت پوچھتے مگر کوئی اثر آثار اس کا معلوم نہ ہوا۔ لالٹین کے گرد بیٹھ کر ہم رات بھر اسی کا تذکرہ کرتے رہتے۔ اس کی صفات بیان کرتے سو جاتے اور اسی کا نام لے کر اُٹھتے۔

بیلے کے ارد گرد تلاش کرنے کے بعد ہم نے گرد و نواح کے گاؤں کا دورہ کرنے کی ٹھانی۔ دوسرے پیریڈ میں بھیّا امرت کا لیے کی بائیسکل لے آئے۔ مجھے کیریئر پر بٹھایا اور خود چلانے لگے۔ کچے پکے راستے کچھ سائیکل پر طے کیے۔ کچھ پیدل ندیاں نالے بڑی مشکل سے عبور کیے اور جب ہم پہلے گاؤں میں داخل ہوئے تو فارم کے

قریب ہمیں ایک نوجوان جاٹ ملا جسے ہم نے کئی مرتبہ قصبے میں دیکھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ ٹھٹکا اور مسکرا کر پوچھنے لگا۔ "شہری چڑیوں کی جوڑی ادھر کیسے بُھول پڑی؟"

بھیّا نے سائیکل سے نے سے اُتر کر کہا۔ "ہمارا کتّا گم ہو گیا ہے اور ہم اس کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔"

مَیں نے جلدی سے کہا۔ "گُل ٹریا تھا، کھڑے کانوں والا گُل ٹریا۔ دو دن ہمارے پاس رہا۔ اس کے بعد بیلے سے کوئی چرا کر لے گیا۔"

وہ شرارت سے مسکرایا اور ہماری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "میرے پاس تو کالا ڈبو ہے، وہ چاہو تو لے سکتے ہو۔"

بھیّا سہم گئے۔ مَیں کچھ بولنے والا تھا کہ انہوں نے میری آستین پکڑ کر کھینچا اور گھبراہٹ میں گویا مجھے گھسیٹتے ہوئے لے چلے۔

گاؤں کے اندر پہنچ کر ہم نے نمبردار کا گھر دریافت کیا۔ اس سے پوچھا تو اس نے تلخی سے کہا۔ "یہ وٹاں والی ہے کانجی ہوس نہیں اور اگر تم اس گاؤں کے لوگوں کو چور سمجھتے ہو تو جا کر پولیس میں رپٹ دے دو۔" ہم اپنا سا منہ لے کر واپس آ گئے لیکن ہمارے حوصلے نہ ٹوٹے اور ہم نے تلاش اسی طرح سے جاری رکھی۔ ہر گاؤں میں مختلف قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر ہم جی نہ چھوڑتے اور ہر گھر میں جھانک کر دیکھ لیتے۔ کئی مرتبہ ہمیں سائیکل نہ مل سکی تو ہم نے کئی کئی کوس کی مسافت پیدل طے کی۔ اگر بھیّا کبھی مایوس ہو جاتے تو میں ان کا حوصلہ بڑھاتا اور کہتا۔ "ایک مرتبہ پتہ چل جائے کہ ٹی ٹی ہے کس کے پاس پھر چاہے وہ لاٹ صاحب کا بچّہ ہو یا اس ملک کا وائسرائے ہو، ہم اپنا ٹی ٹی نہ چھوڑیں گے لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ اس کا پتہ ہی نہیں چلتا۔"

مَیں کہتا۔ "بھیا آدمی نہ سہی۔ اس گاؤں کا ہی پتہ چل جائے جہاں ہمارا ٹی ٹی ہے، پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے۔"

بھیا میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے تو میں کہتا۔ "اس گاؤں کو آگ لگا دوں گا۔ اپنی کلاس ساتھ لا کر فصلیں اجاڑ دوں گا۔ اس پر بھی انہوں نے ٹی ٹی نہ دیا تو افضل کے ابا جی سے کہہ کر تھانے پکڑوا دوں گا۔" اور بھیّا ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے

لگے۔ "مشکل تو یہی ہے کہ اس کا پتہ نہیں چلتا۔"

ایک رات ہم ایسی ہی باتیں کر رہے تھے کہ بھیّا نے کہا۔ "جس گاؤں میں ہم پہلے روز گئے تھے، میرا خیال ہے ٹی ٹی وہیں ہے۔"

میں چوکنا ہو کر بیٹھ گیا اور بھیّا سے پوچھنے لگا۔ "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ کیا آپ نے ٹی ٹی کو وہاں دیکھا تھا؟"

"دیکھا تو نہیں تھا۔" بھیا نے کہا۔ "مگر وہ آدمی جو گاؤں سے باہر ہمیں فارم کے پاس ملا تھا، چور معلوم ہوتا تھا۔ تمہیں پتہ ہے، وہ ہمیں مذاق کر رہا تھا۔ میرا جی کہتا ہے، اس نے ٹی ٹی کو چھپا رکھا ہے اور شام کے وقت اسے سیر کرانے کے لیے باہر نکالتا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں وہ چور ہی لگتا تھا۔ چوری چھپانے کے لیے بار بار مسکراتا تھا۔ میرا بھی جی کہتا ہے، ٹی ٹی اس کے پاس ہے۔"

رات بھر ہم اسی قسم کی باتیں کرتے سو گئے اور اسی دن شام کو اباجی کی الماری سے پستول نکال کر پاپیادہ اس گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ہم نے اپنے آپ کو فارم کے ایک محفوظ کونے میں چھپا لیا اور گاؤں سے آنے والے راستے پر اپنی نگاہیں جما دیں۔ لوگ آ جا رہے تھے لیکن ان میں وہ کالا ڈبو نہیں تھا جس کی مسکراہٹ اس کے چور ہونے کی غمازی کرتی تھی۔ بڑی دیر تک ہم اسی طرح بیٹھے رہے۔ میں نے پستول بھیا کے ہاتھ سے لے لیا اور انہیں کہا کہ وہ باہر آنے جانے والے کو غور سے دیکھتے رہیں، جونہی وہ آدمی ٹی ٹی لے کر ادھر سے گزرے، مجھے ٹھوکا دے کر ہوشیار کر دیں۔ اس کے بعد میں جانوں اور میرا کام۔ گو اس سے پہلے میں نے پستول کبھی نہ چلایا تھا اور نہ ایسا کرنے کی ہمت ہوئی تھی مگر اس دن مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں صرف اسی کام کے لیے پیدا ہوا ہوں اور یہ کام صرف مجھی سے انجام کو پہنچ سکے گا۔ ہم رات کو اس بدذات چور کا انتظار کرتے رہے، پر وہ برآمد نہ ہوا۔ شاید اس کو ہمارے ارادے کا علم ہو گیا تھا اور وہ ہم سے ڈرنے لگا تھا۔

کتنی رات گزر جانے کے بعد ہم گھر پہنچے۔ پھپھی جان کو ہولے سے آواز دے کر دروازہ کھلوایا اور پستول واپس الماری میں رکھ کر اپنے اپنے بستروں میں دبک گئے۔ ہر رات سکیمیں بناتے اور دن کے وقت ان پر عمل بھی ہوتا رہا مگر ٹی ٹی نہ ملنا تھا نہ

ملا۔ آخر ایک رات ہم نے دو رکعت نماز نفل ادا کر کے یہ دعا مانگی کہ اللہ میاں اگر وہ زندہ ہے تو صبح تک آپ سے آپ ہمارے پاس پہنچ جائے اور اگر مر گیا ہے تو یہ سارا ثواب اس کی روح کو پہنچے۔ دعا کرنے کے بعد ہم اپنے اپنے سینوں پر پھونکیں مار کر سو گئے۔ کئی صبحیں آئیں اور گزر گئیں مگر ٹی ٹی نہ آیا۔ محلے میں دن رات بہت سے کتے بھونکتے رہے مگر کسی میں بھی ٹی ٹی کی سی گھن گرج پیدا نہ ہو سکی۔

اور آج کئی سالوں کے بعد یہ سارا واقعہ میرے ذہن میں پھر تازہ ہو گیا ہے۔

اس وقت میں چچا ابا کے گھر تیسری منزل کی چھت پر بیٹھا ہوں اور نیچے پھولوں سے لدی پھندی ایک کار سرخ و سبز جھنڈیوں تلے کھڑی ہے۔ اس کے ارد گرد بہت سے بچے زرق برق لباس پہنے اُچھل کود رہے ہیں۔ ڈوبتا ہوا سورج بروکیڈ کی اچکن میں سنہری کرنیں بن رہا ہے اور اچکن والا بڑی بے صبری سے سگریٹ کے کش لگائے جاتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ جس چھت پر میں کھڑا ہو ں، عین اس کے نیچے چھوٹے سے کمرے میں بھیّا اپنی منحنی سی ٹانگیں میز پر رکھے کرسی پر دراز ہیں۔ ان کے بائیں پاؤں پر ٹخنے کے نیچے مغلئی پھوڑے کا ایک پرانا نشان ہے جو مسکراتے ہوئے بچے کا چھوٹا سا چہرہ لگتا ہے۔ بھیا اپنے بالوں کو پنسل سے کرید رہے ہیں۔ ایک کتاب ان کی گود میں کھلی پڑی ہے اور وہ بھی میری طرح کھڑکی سے نیچے جھانک رہے ہیں جہاں پھولوں سے لدی پھندی کار کے پاس بروکیڈ کی اچکن پہنے ایک سیاہ فام نوجوان کھڑا ہے جو لڑکی اس کار میں سوار کرانے کے لیے لائی جا رہی ہے بھیّا نے اس کے بارے میں کبھی کسی کو کچھ نہیں بتایا لیکن مجھے ان کی ڈائری کا ایک ورق یاد آ رہا ہے۔ ان کی الماری کھلی رہ گئی تھی۔ وہ اپنے طلبہ کو تاریخی عمارات کی سیر کرانے لے گئے تھے اور شام سے پہلے نہ لوٹ سکتے تھے۔ میں نے ان کی ڈائری نکال کر جلدی جلدی پڑھنا شروع کر دی۔ شکستہ انگریزی میں انہوں نے ایک ایک تاریخ میں کاپی کے متعدد صفحات سیاہ کر رکھے تھے۔ انہوں نے لکھا تھا—— یہ دن بڑا سہانا ہے۔ ہم صبح کیرم کھیلتے رہے۔ "ت" مجھے اچھے اچھے لطیفے سنا کر خوب ہنساتی رہی۔ پھر میں "ایڈ نیٹ" کے مختلف اقتباسات اسے سناتا رہا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور میرے چھلے کو میری انگلی میں گھمائے جاتی تھی۔ میں نے پڑھنا بند کر کے

کہا۔ "زیور عورتوں کی جان ہوتا ہے۔ دیکھو تم کس محبت اور شوق سے چھلّے کو گھما رہی ہو اور تمہیں شاید اس کا علم بھی نہیں کہ تم کیا کر رہی ہو۔" اس نے بُرا مان کر ہاتھ روک لیا اور میری طرف منہ کر کے بولی۔ "تم سمجھتے ہو، مَیں ہر انگلی کے چھلّے کو اسی طرح گھماؤں گی کیونکہ میں عورت ہوں اور عورت کو زیور عزیز ہوتا ہے۔" مَیں نے ڈرتے ہوئے کہا "ہاں" "ت" نے کہا "خیر ہم ایسے کنگال بھی نہیں۔ میں نے ایسے بہت سے چھلّے دیکھے ہیں، لیکن انہیں اس طرح پھرانے کی تمنا کبھی میرے دل میں پیدا نہیں ہوئی۔" پھر وہ ذرا رک کر بولی۔ "اگر اس انگلی میں گھاس کا چھلا بھی ہوتا تو بھی مَیں اسی شوق سے گھماتی۔" آگے بھیا نے لکھا تھا۔ "آج مجھے یوں لگتا ہے جیسے کائنات کی سب سے معزّز ہستی ہوں۔ جانداروں میں سب سے محترم ہوں۔ میرا جی اپنی عزت آپ کرنے کو چاہتا ہے اور مجھے چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے ایسے لگتا ہے جیسے حضوری کے تمام آداب مجھ میں سمٹ آئے ہوں۔ "ت" دوسری لڑکیوں سے کس قدر مختلف ہے۔ اسے دنیوی مال و متاع اور جاہ و جلال کا ذرا بھی تو پاس نہیں۔"

مَیں چھت پر سے نیچے جھانک رہا ہوں اور بھیّا بھی کھڑکی میں سے اسی گروہ کا نظارہ کر رہے ہیں جس پر میری نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔ "ت" سرخ رنگ کی مسالہ ٹکی اوڑھنی اوڑھے عورتوں کے جلو میں کھڑی ہے۔ بروکیڈ کی اچکن والا پھولوں کی لڑیاں ایک طرف ہٹا کر کار کا دروازہ کھول رہا ہے اور گل ثریا بڑے حجاب اور بڑی لہک کے ساتھ اندر داخل ہو رہی ہے۔ اس نے سر جھکا کر کار میں ایسے قدم رکھا جیسے وہ بھیّا کو جانتی ہی نہیں۔ آج میرے پاس میرا اپنا پستول ہے لیکن وہ چل نہیں سکتا۔ اس وقت میری آنکھوں کے سامنے کا لاڈبو گل ثریا کو لیے جاتا ہے اور مَیں اپنے پیارے بھیّا کی مدد نہیں کر سکتا۔ وہ بھیّا جو آج بھی ہم سے اتنا ہی پیار کرتے ہیں جتنا بچپن میں کیا کرتے تھے۔ وہ جو کمرے میں میز پر ٹانگیں رکھے یہ سب دیکھ رہے ہیں اور جن کے نتھنے کے نیچے مغلئی پھوڑے کا ایسا مسکراتا نشان ہے جسے خوامخواہ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ ابھی کار چلے گی اور بھیا کے پاس ایک ڈائری رہ جائے گی جیسے ٹی ٹی کے گم ہو جانے پر ہمارے پاس زنجیر رہ گئی تھی۔

☆------------☆

تنکہ

سلسلہ قاف کی ایک جھیل میں جہاں صنوبر کے بہت سے درخت ایستادہ ہیں اور جس کے کنارے گھنے بید کی شاخیں صدیوں سے سورج کو روکے کھڑی ہیں۔ ایک ڈونگا تیرتا رہتا ہے جس میں ایک جواں سال شہزادی بال کھولے لیٹی رہتی ہے۔ اس علاقے کے معتمد دیومالا نے اس شہزادی کی زندگی سے وقت کو خارج کر دیا ہے اور شہزادی کی عمر آج بھی اتنی ہی ہے جتنی آج سے کئی ہزار سال پہلے تھی۔ جب شہزادی کو اس گھور اندھیرے میں زندگی بسر کرتے کئی قرن گزر گئے تو اس نے بید کے جھنڈ میں چہچہانے والی چڑیوں سے درخواست کی کہ وہ کہیں سے اسے روشنی کی ایک کرن لا دیں لیکن چڑیاں اسی طرح چہچہاتی رہیں۔ اس نے صنوبر کی شاخوں میں بسیرا لینے والے پرندوں سے گڑگڑا کر کہا کہ وہ روشنی کے پہاڑ سے اجیالے کی ایک ڈلی توڑ کر لا دیں، پر اس کی گڑگڑاہٹ جھیل میں ڈوب کر رہ گئی۔ ان تاریک لمحوں میں ایک شام وہ روشنی کی تمنا میں سسکیاں بھر رہی تھی تو پروانوں کا ایک گروہ ادھر آ نکلا۔ شہزادی نے انہیں پکار کر اپنی طرف بلایا اور کراہتے ہوئے کہا۔ "میں روشنی کی ایک کرن کے لیے ترس گئی ہوں اور میرے ساتھی میری مدد نہیں کرتے۔ تم میں سے جو کوئی مجھے روشنی لا دے گا مَیں اس کے ساتھ شادی کر لوں گی۔" یہ سنتے ہی پروانے دنیا کے چاروں کھونٹ پھیل گئے اور روشنی حاصل کرنے کے لیے شمعوں پر جل جل کر مرنے لگے۔ کئی سال گزر گئے۔ ان پروانوں کے بچّے اور پھر ان کے بچّے اور ان بچّوں کے بچّے شہزادی کا سوئمبر جیتنے کی غرض سے دھڑا دھڑ جلتے رہے لیکن وہ اس ڈونگے کا کوئی کونہ منور نہ کر سکے۔ صدیاں گزر گئیں۔ زمانے بنتے اور بگڑتے رہے اور پروانے اسی طرح جلتے رہے۔ ایک دن ایک

کا ہل جگنو اچانک اس وادی میں جا نکلا اور اڑتا گھومتا بید کی شاخوں سے ہوتا ہوا اس جھیل کے کنارے پہنچ گیا۔ شہزادی خوشی سے چلّا اٹھی۔ اس نے اپنی بانہیں آگے پھیلا کر کہا۔ "تم میرے لیے روشنی لے آئے، میرے پروانے!" جگنو شہزادی کی بات سمجھے بغیر اس کی جھولی میں گر گیا اور شہزادی کے چہرے پر روشنی کی لہریں مٹنے ابھرنے لگیں۔ اس نے جگنو سے شادی کر لی اور پھر ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگے لیکن اس شادی کی خبر پروانوں کو آج تک نہیں ملی۔ وہ اسی طرح جل رہے ہیں اور شعلوں پر جھپٹ رہے ہیں۔ آج بھی ہر پروانہ جو سر سے کفن لپیٹے شعلے کی طرف لپکتا ہے، یہی سمجھتا ہے کہ اس نے سہرا باندھ رکھا ہے اور وہ شہزادی کو بیاہنے جا رہا ہے۔

صوبیدار رنیتے خان کے لڑکے کو پڑھنے کی لت پڑ گئی اور وہ پڑھتے پڑھتے بی۔اے تک جا پہنچا۔ باپ کا خیال تھا کہ سپاہی زادہ دسویں پاس کرنے کے بعد فوج میں لیفٹیننٹ ہو جائے گا۔ گھر میں روپوں کی ریل پیل بھی ہو گی اور خاندان کی عزت کو بھی چار چاند لگ جائیں گے لیکن سپاہی زادہ صرف رنیتے خاں کا لڑکا ہی نہ تھا، اس کی رگوں میں بصرے کے قبیلہ تاری کی لڑکی کا خون بھی شامل ہو گیا تھا اور اس کا وجود تلواروں کی جھنکار اور قرأت کے اتار چڑھاؤ کی ہم آہنگی سے استوار ہوا تھا۔

چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں تالاب کے کنارے صوبیدار کا مکان تھا جس کا ایک کمرہ سرور کے لیے مخصوص ہوتا — گاؤں میں ہوتا تو دن بھر اپنے کمرے میں بیٹھا کتابیں پڑھتا رہتا اور جب باہر ہوتا تو یہ کمرہ مقفل رہتا اور کسی کو ادھر جھانک کر دیکھنے کی جرأت بھی نہ ہوتی۔ بی۔اے کا امتحان دیئے اسے ایک ماہ گزر چکا تھا لیکن مطالعے کا یہ عالم تھا گویا کل پہلا پرچہ ہو۔ سرور کو شاعری کا کچھ ایسا چسکا پڑا تھا کہ دن بھر ہزاروں شعر پڑھنے کے بعد بھی سیری نہ ہوتی۔ مطالعے کے بعد اگر کسی چیز کا شوق تھا تو وہ شکار تھا۔ عمر خیام کے مصور ایڈیشن کا مطالعہ کرتے ہوئے جب وہ کسی رباعی پر پھڑک اُٹھتا تو اس کی نگاہ دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی ڈبل بیرل پر جا پڑتی اور وہ مسکرا کر کہتا۔ "خدا کا شکر ہے کہ مَیں فردوس مکانی محی الدّین اورنگزیب عالمگیر کے زمانے میں پیدا نہیں ہوا جو شعر و شکار کو کارِ بیکاراں تصور کرتے تھے بلکہ ایسے زمانے میں آنکھ کھولی ہے جس کے لوگ علم و ادب کے مقابلے میں دنیا کی ہر چیز کو ہیچ سمجھتے ہیں۔" اور واقعی سرور بہت خوش

قسمت نوجوان تھا کیونکہ وہ اس دور کی پیداوار تھا جس میں صرف پڑھے لکھے لوگ ہی جہانگیری اور جہانبانی کر سکتے ہیں۔ جہاں پنج ہزاروی، دس ہزاروی، جیغہ اور کلغی لگانے والے اور تختِ طاؤس پر بیٹھنے والے سر نیہوڑا کر چلتے ہیں کیونکہ یہ دور سلطانی جمہور کا دور ہوتا ہے۔

بڑے پیرزادہ صاحب نے ایک دن سرور کو بلا بھیجا اور اپنے ساتھ پلنگ پر بٹھا کر چائے پلائی۔ یہ اس گاؤں کے مالک بھی تھے اور پیر بھی۔ ان کے نام کا سکہ دُور دُور چلتا تھا اور ان کے تعویز سمندر پار تک جاتے تھے۔ انہوں نے بڑے پیار سے سرور کے کندھے پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔ "تو اپنے گاؤں کا بیٹا ہے اور اس علاقے میں ایک ہی پڑھا لکھا نوجوان ہے۔ میں تجھ سے اور تیرے باپ سے خوش ہوں۔ تو جانتا ہے میرے مرحوم بھائی اور بھاوج کی ایک نشانی میری بھتیجی لاہور میں پڑھتی ہے۔ اس مرتبہ اس کے امتحان کی رپورٹ کچھ تسلی بخش نہیں۔ تو ان دنوں فارغ تو ہے ہی، اگر دو گھنٹے اسے پڑھا دیا کرے تو میں تیرے حق میں دعا کروں اور تیرے باپ کو فوجی خدمات کے صلے میں ایک آدھ مربع بھی دلوا دوں۔" جب انہوں نے سرور کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے اپنا بدن ذرا سا چرایا اور جب انہوں نے یہ بات کہی تو وہ کسمسایا لیکن انکار کرتے وقت وہ گھبرا گیا اور اس نے حامی بھر لی۔

تیسری منزل کے چوبارے میں جب وہ آبنوس کی کرسی پر بیٹھا دانتوں سے ناخن کتر رہا تھا تو پردے کی اوٹ سے ایک ہاتھ برآمد ہوا۔ سرور نے اپنا کام چھوڑ کر کتاب پکڑ لی اور اسے گود میں ڈال کر یہ سوچنے لگا کہ اب بات کیسے شروع کرے۔ کتاب کے کونے پر لکھا تھا۔ عطیہ بانو پیرزادی، رول نمبر 132 سیکنڈ ایئر۔ جب سرور کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی تو اس نے ہولے سے کھنکار کر کہا۔

"آپ کا رول نمبر ایک سو بتیس ہے؟"

"جی ہاں۔"

اور بڑی دور جیسے قاہرہ ریڈیو سٹیشن سے امّ کلثوم نے عربی نغمے کا پہلا بول ادا کیا ہو۔

سرور کو جب اپنے بے ہودہ سوال کا احساس ہوا تو اس نے کہا۔ "رابن ہُڈ اینڈ

ایلن اڈیل میں شاعر نے ایک مشہور قصے کو نظم کر دیا ہے اور اس بات ——"

عطیہ نے بات کاٹ کر پوچھا۔ "جی یہ رابن ہڈ واقعی کوئی آدمی تھا یا یونہی قصہ ہے؟"

"تھا کیوں نہیں۔ واقعی ایک آدمی تھا۔ بڑا بہادر آدمی۔" سرور نے پروفیسروں کا طریق اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "جیسے ہمارے یہاں راجہ رسالو تھا —— راجہ رسالو کو جانتی ہیں آپ؟ وہی جس کا غار مشہور ہے۔" عطیہ نے ہولے سے ہنس کر کہا۔ "جی جانتی تو نہیں لیکن اس کے بارے میں سُنا ضرور ہے —— جی اس کے پاس ایک تیر کمان بھی تھی۔"

"ہاں وہی۔" سرور نے سر کھجا کر کہا۔ "آپ کے پاس کاپی ہو تو آپ ساتھ ساتھ معنی بھی لکھتے جائیں۔"

چوبارہ تیسری منزل پر تھا۔ بلّی بھی سیڑھیاں چڑھتی تو آہٹ ہوتی، پتّہ بھی کھڑکتا تو پتہ چل جاتا۔ اس لیے پردہ آہستہ آہستہ سرکنے لگا۔ جب عطیہ معنی لکھ رہی ہوتی تو سرور چور نگاہوں سے اسے دیکھ لیتا۔ جب سرور نظم پڑھنے میں مصروف ہوتا تو عطیہ کنکھیوں سے ادھر دیکھ لیتی اور پھر اپنی کاپی پر جھک جاتی۔

اور جب دنوں کی کتنی ساری پتلی پتلی رسیاں بل کھا کھا کر مہینے کا موٹا رسّہ بن گئیں تو عطیہ اور سرور نٹوں کی طرح اُچک کر اس رستے پر چڑھ گئے اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کانپنے لگے۔

عطیہ نے منہ پُھلا کر کہا۔ "مَیں آپ سے نہیں بولتی۔ پرسوں آپ ہڑیال شکار کر کے لائے اور ہمارے گھر گوشت کی ایک بوٹی تک نہ بھیجی۔ بٹے میں آپ سے نہیں پڑھتی۔"

سرور کھسیانا ہو گیا اور نگاہیں نیچی کر کے بولا۔ "مجھے بڑے آدمیوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ بڑے پیرزادہ صاحب مجھ سے ناراض ہو جاتے کہ ایک سپاہی زادے نے ہمارے گھر میں گوشت کیوں بھیجا تو مَیں کیا کرتا؟"

"ناراض ہو جاتے تو ہم ان کو راضی کر لیتے۔" عطیہ نے آنکھیں نچا کر کہا —— "انہیں منانا کون سی بڑی بات ہے —— لیکن میں تو آپ سے بولتی ہی نہیں۔"

"لیکن مَیں تو —— مَیں نے تو" اور سرور کو کوئی بات نہ سوجھی اور اس نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے معاف کر دو۔"

جب عطیہ نے اسے معاف کر دیا تو وہ بہت خوش ہوا اور اپنی بندوق کی تعریفیں کرنے لگا اور اس کے کندے کو سراہنے لگا جہاں اس کا رخسار ٹھیک بیٹھتا تھا اور نشانہ خطا نہیں ہوتا تھا۔

عطیہ نے یونہی خوفزدہ ہو کر کہا۔ "ہائے بندوق چلاتے ہوئے تو بڑا دھکا لگتا ہے۔"

"دھکا!" سرور نے حیران ہو کر کہا۔ "ہاں پہلے پہلے ذرا محسوس ہوتا ہے، اس کے بعد تو عادت ہو جاتی ہے۔"

عطیہ نے پوچھا۔ "یہ بندوق چلانا بڑی مصیبت ہے نا؟ جب ایک کارتوس جل جاتا ہو گا تو کتنی خوشی ہوتی ہو گی کہ چلو ایک تو کم ہوا۔"

"ہوں!" سرور نے ذرا چونک کر کہا۔ "ہاں —— لیکن —— ہاں —— بس ایسا ہی ہے۔"

دراصل اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ کوئی شاعروں کی سی بات کرے کہ بندوق سے زیادہ تمہارے ابریشمی بال مصیبت ہیں۔ یا کارتوس سے زیادہ تمہاری آنکھیں خطرناک ہیں —— لیکن یہ تشبیہیں کچھ مناسب نہ تھیں اور وہ سوچتا ہی رہ گیا۔

آرام کرسی میں لیٹ کر جب وہ سوچ میں ڈوب جاتا اور عطیہ ہولے سے اس کا کندھا ہلا کر کہتی۔ "کیا سوچ رہے ہو؟" تو اس کا جی جواب دینے کو نہ چاہتا اور وہ ایک بار پپوٹے جھپک کر مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا۔ "کچھ بھی نہیں۔" "کچھ تو ہے۔" عطیہ پوچھتی۔

"سچ کچھ بھی نہیں۔" وہ ایک بار پھر اسی طرح مسکراتا اور عطیہ روٹھ جاتی۔

سرور عطیہ کے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کو ایک ہاتھ میں اور دو کو دوسرے ہاتھ میں پکڑ کر کہتا۔ "مَیں بھی تمہارے ایسا امیر ہوتا تو کتنی اچھی بات تھی۔"

اور عطیہ اپنا ہاتھ چھڑا کر پوچھتی۔ "بس یہی بات سوچ رہے تھے۔"

"ہاں۔"

"تم سے کتنی مرتبہ کہا ہے ایسی باتیں نہ سوچا کرو۔"

"کیوں؟"

عطیہ پہلے ذرا مسکراتی، پھر تسلی آمیز لہجے میں کہتی۔ "اللہ میاں نے ہر شخص کی قسمت ایک تختی پر پہلے سے لکھ رکھی ہے اور اس میں کوئی ردّوبدل نہیں ہو سکتی، جو کچھ ہوتا ہے، اس لوحِ محفوظ کے مطابق ہوتا ہے اور ——"

سرور بات کاٹ کر کہتا۔ "اور میری لوحِ محفوظ پر غریبی لکھی ہے۔"

"ہاں۔" عطیہ درد بھرے لہجے میں کہتی۔ "خدا جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔" پھر وہ کرسی کے بازو پر بیٹھ جاتی اور سرور کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتی۔ "تم دل میلا نہ کرو اور ایسی باتیں نہ سوچا کرو۔"

لیکن ایسی باتیں نہ سوچ کر بھی سرور کا دل میلا ہی رہتا۔

سارا گاؤں پیرزادہ صاحب کی اس لیے عزت کرتا تھا کہ وہ گاؤں کے مالک تھے۔ ان کی بے شمار زمینیں تھیں، اَن گنت مزارعے تھے، سینکڑوں مویشی تھے اور پیٹیوں کے علاوہ بینکوں میں کتنا ہی روپیہ تھا اور وہ وقت بے وقت لوگوں کو قرض دیتا رہتا تھا اور لوگ سرکار کو اس لیے مان دیتے تھے کہ سرکار کے خزانے بھی روپے سے بھرے ہوئے تھے اور اس کی جاگیریں بہت وسیع تھیں اور ان پر سورج کبھی غروب نہ ہوتا تھا' لیکن لوگ رحیتے خاں کی عزت نہ کرتے تھے۔ حالانکہ اس کے پاس ملٹری کراس تھا۔ اس نے گاؤں کی بہو بیٹی کو زندگی میں نہ تاکا تھا اور اس نے کسی کو نہ ستایا تھا۔ وہ باقاعدہ نماز پڑھتا تھا۔ روزے رکھتا تھا اور اپنی حیثیت کے مطابق خیرات بھی کرتا تھا لیکن لوگ نہ تو چکر کاٹ کر اسے سلام کرنے آتے تھے اور نہ اس کی آمد پر کھڑے ہوتے تھے۔ سرور جانتا تھا کہ چونکہ یہ لوگ جاہل ہیں، اس لیے انہیں آدمی کی پرکھ نہیں ہے۔ اس کا ایمان تھا کہ خدا جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ خدا نے دیو جانس کلبی کو عزت دی تھی اور سکندر پاپیادہ اس کے حضور میں آیا تھا اور دیو جانس کلبی اس لیے معزز تھا کہ سکندر کو آدمیوں کی پرکھ تھی لیکن سرور کے گاؤں والے اَن پڑھ تھے اور وہ رحیتے خان کی عزت نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ خدا نے اسے عزت دے رکھی تھی۔

عطیہ املا کی غلطیوں کو پانچ مرتبہ لکھ رہی تھی اور اس نے اپنے نچلے ہونٹوں کو دانتوں میں دبا رکھا تھا۔ سرور نے کتاب سے نگاہیں ہٹا کر سفید پردے کو دیکھا اور پھر سارے کمرے کا جائزہ لیا۔ کتاب بند کر کے اس نے تپائی پر رکھی، آہستہ سے اُٹھا اور عطیہ کے قدموں میں قالین پر بیٹھ گیا اور اپنا چہرہ اس کی گود میں پڑی ہوئی کاپی پر رکھ دیا۔ تازہ لکھی ہوئی غلطی کی سیاہی اس کی ٹھوڑی پر لگ گئی۔ عطیہ نے کاپی کا کنارہ چھوڑ کر اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور جب سرور نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا تو عطیہ کو اس کی ٹھوڑی پر روشنائی کا نشان نظر آیا۔ اپنے شفون کے سفید ڈوپٹے کو عطیہ نے سیدھی انگلی کے گرد لپیٹا اور لب لگا کر نشان دُور کرنے لگی۔

سرور نے گڑگڑا کر کہا۔ "کچھ اچھا نہیں ہوا۔ یہ پڑھنے کا سلسلہ یہ پڑھانے کا مشغلہ —— مجھے کیا ہو گیا ہے عطیہ؟ یہ سب کچھ کیا ہو گیا —— کیوں ہو گیا عطیہ —— اور کچھ اچھا نہیں ہوا۔"

عطیہ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "پتہ نہیں —— میری قسمت میں تم سے پڑھنا لکھا تھا —— تمہاری قسمت میں مجھے پڑھانا لکھا تھا —— مَیں بھی تو —— سرور میں بھی تو —— تم اس طرح نہ کیا کرو —— پتہ نہیں سرور —— پتہ نہیں۔"

سرور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے عطیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"میرا ساتھ تو نہ چھوڑو گی؟ مجھے بھلا تو نہ دو گی؟"

عطیہ نے انگلی کے گرد لپیٹے ہوئے دوپٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "پتہ نہیں مَیں تمہارا ساتھ کیسے دوں گی۔ کیسے دے سکوں گی لیکن یاد تو میرے اپنے بس کی بات ہے —— تم کیسے بھلائے جا سکتے ہو —— تمہیں کون بھول سکتا ہے —— مَیں تو —— مَیں تو —— تمہیں تو کوئی بھی۔" اس کے آنسو بھر آئے اور وہ بول نہ سکی۔ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ دو ذہنوں میں بیک وقت ایک ہی بات گھوم رہی تھی۔ دو وقت مل رہے تھے، شام دریچوں اور دروازے کے راستے اندر داخل ہو رہی تھی اور شفون کے براق دوپٹے کا نیلگوں داغ معدوم ہو گیا تھا۔

چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ کالج کھل گئے اور عطیہ واپس چلی گئی۔ پہلے سرور کا ارادہ بی۔اے پاس کرنے کے بعد ولایت جانے کا تھا لیکن اب اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا تھا۔

اپنا دیس چھوڑنے کو اس کا جی نہ چاہتا تھا۔ عطیہ سے جدا ہونے پر اس کی روح کو قرار نہ تھا اور اپنے گاؤں کے لوگوں سے اسے پیار ہو گیا تھا۔ سولجرز بورڈ نے اس کے وظیفے کے لیے جو کچھ کیا تھا، اس کا شکریہ ادا کر کے سرور نے انکار کر دیا۔

ہر صبح وہ اپنی بندوق لے کر شکار کی تلاش میں پہاڑوں اور وادیوں میں مارا مارا پھرتا۔ جب جانوروں کی کوئی ٹکڑی اس کے سر پر سے گزرتی تو وہ نالی اوپر اٹھا کر ٹھائیں سے فائر کر دیتا اور اس کے کندھے کو بڑا دھکا لگتا۔ جب کسی پہاڑ کی چوٹی پر کوئی موٹا تازہ ہڑیال نمودار ہوتا تو وہ چھپ چھپ کر ادھر جانے کے بجائے یونہی چلتا رہتا اور جب ہڑیال اُس کی آہٹ پا کر پہاڑی سے وادی میں کود جاتا تو وہ لبلبی دبا تا، بندوق دغتی اور پہاڑوں سے قہقہے کی صدا بلند ہوتی۔ سرور بندوق کھولتا تو ایجیکٹر خالی کارتوس کتنی دور اڑا دیتا۔ وہ بلندی سے نیچے کو لڑھکتے ہوئے خول پر نگاہیں گاڑ دیتا اور مسکرا کر کہتا۔ چلو ایک کارتوس اور کم ہوا۔ ایک مصیبت اور کٹی، پھر وہ کسی بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر عطیہ سے باتیں کرنے لگتا اور یہاں باتیں کرتے ہوئے نہ اس کے خیال کا سلسلہ ختم ہوتا اور نہ کوئی بات ادھوری رہتی۔ عطیہ چُپ چاپ اس کے پہلو میں کھڑی ساری باتیں سنتی رہتی لیکن جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہتی اور ایک دن جب سرور کسی اُبھرے ہوئے پتھر سے ٹھوکر کھا کر گھٹنوں کے بل گر گیا اور اس کی بندوق ہاتھ سے چھوٹ کر پرے جا پڑی تو اس نے دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹیک کر سر اوپر اٹھایا اور اسے شیلے کی نظم کا ایک بند یاد آ گیا۔ عطیہ اس کے سامنے کھڑی تھی، سرور نے رحم طلب نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہا۔

مجھے اٹھاؤ
ایک لہر کی طرح، ایک پتے کی طرح، ایک بدلی کی طرح،
میں زندگی کے خارزار میں گر گیا ہوں۔
اور میرا خون بہہ رہا ہے۔

دونوں وقت مل رہے تھے، پرندے اپنے گھونسلوں میں بسیرا لینے کے لیے آ رہے تھے۔ سرخ و کبود بدلیاں اِدھر اُدھر تیر رہی تھیں۔ وہ التجا آمیز نگاہوں سے ایک ہی طرف تکے جا رہا تھا اور عطیہ اسے اٹھا نہیں رہی تھی۔

کالج کے آہنی گیٹ پر کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں سوکھ گئیں، لیکن چپراسی

نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ تک نہ کیا۔ جب پہلی چٹ کا کوئی جواب نہ آیا تو اس نے دوسری چٹ بھیجی اور اب تیسری مرتبہ چپراسی کو زحمت دینے کی اس کو ہمت نہ ہوتی تھی۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں گیٹ کے پاس چکر لگا رہا تھا اور چپراسی کا نفس موٹا کرنے کے لیے کوئی مناسب فقرہ ڈھونڈ رہا تھا کہ اچانک عطیہ برآمد ہوئی۔ وہ مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں کھلا ہوا پن اور بائیں میں لٹکتے ہوئے دوپٹے کا کنارہ تھا اور سورج کی تیکھی کرنوں کے سامنے اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ وہ سرور کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر چھجا بنا کر بولی۔

"تمہیں بہت انتظار کرنا پڑا نا! سچ مجھے معاف کرنا——اتنی مصیبت ہے۔" سرور نے بات کاٹ کر کہا۔ "خیر اب معاف کرتے ہی بن پڑے گی ورنہ مَیں تو—— لیکن ہم باتیں کہاں بیٹھ کر کریں؟"

"یہ ساتھ ہی ملاقات کا کمرہ ہے۔" عطیہ نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

"پر یہاں تو اور بھی——"

"تو تم میرے ساتھ باہر نہیں جا سکتی ہو؟" سرور نے پوچھا اور عطیہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے مان گئی۔

ہوٹل کے ایک کیبن میں بیٹھ کر عطیہ نے کہا۔ "اگر کسی کو پتہ چل جائے کہ مَیں تمہارے ساتھ یہاں ہوں تو——!"

"تو تمہیں جرمانہ ہو جائے۔"

عطیہ نے تننے کی کوشش کی، لیکن اس کے چہرے پر پیلاہٹ پھیل گئی۔ وہ دیر تک سرور کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی اور پھر اسے مخاطب کیے بغیر جیسے اپنے آپ سے کہنے لگی۔ "پچھلی اتوار کو بڑے ابا جی یہاں آئے تھے۔ انہوں نے میری منگنی کا ارادہ پکا کر لیا ہے۔ کوئی عزیز الدین ہے۔ جنگ میں اُنیس ہزار روپیہ کمایا ہے اور ابا جی نے اس کی پاس بُک دیکھ کر اپنا ارادہ پکا کر لیا ہے۔"

"اور تم نے؟" سرور نے آہستہ سے پوچھا۔

"مَیں کیا کروں سرور؟" وہ رونے لگی اور آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "پتہ نہیں وہ کون ہے، کیسا ہے۔ صرف اُنیس ہزار روپے ہی تو سب کچھ نہیں ہوتے اور ہوں بھی

تو——ہوں بھی تو——"

سرور نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔ "تو مجھ سے شادی نہیں کرو گی؟"

"کروں گی سرور، ضرور کروں گی۔" اس کے آنسو تیزی سے بہنے لگے اور اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "پر——پر——"

سرور نے بلا سوچے سمجھے کہا۔ "لو چلو ہم ابھی نکاح پڑھوا لیتے ہیں۔ میں شکار مار کر لایا کروں گا۔ تم کباب بنایا کرنا۔ ہم خانہ بدوشوں کی طرح پہاڑوں میں رہیں گے۔ سمور کے کوٹ پہنیں گے اور چربی کے چراغ جلایا کریں گے۔"

عطیہ نے اس کی بات سنے بغیر کہا۔ "اگر تم بھی بزنس کیا کرتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ اگر تمہارے پاس اتنا ہی روپیہ ہوتا تو ابا جی کبھی انکار نہ کرتے۔"

سرور نے دکھے دل سے کہا۔ "لو میرے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آتا اور اگر ہوتا بھی——"

عطیہ نے کہا "یا اگر تم کوئی بڑے آفیسر ہوتے—— لیکن تم نے نوکری کیوں نہیں کی؟"

"نوکری مجھے اچھی نہیں لگتی۔" سرور نے میز پر ناخن رگڑتے ہوئے کہا۔

"لیکن اگر تم کہتی ہو تو چلو میں نوکری بھی کر لوں گا۔"

عطیہ خوش ہو گئی۔ اس نے آنسو پونچھ کر کہا۔ "مرد کماتے ہی اچھے لگتے ہیں۔ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے والے مرد تو مرد ہی نہیں لگتے۔"

سرور نے کہا۔ "تم میرے ساتھ ہو گی تو جیسا حکم کرو گی، ویسا ہی ہو گا۔"

عطیہ گھبرا گئی۔ اس نے دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ "مَیں نے بڑے ابا جی سے کہہ دیا ہے کہ ابھی میں اور دو سال تک شادی نہیں کرواؤں گی۔"

"تو——تو" سرور نے سراسیمہ ہو کر کہا۔

"جب تک تمہارے پاس کافی روپے ہو جائیں گے۔ تم ایک ایک پائی جمع کرتے رہنا اور دو سال بعد اپنی کار میں گاؤں آنا۔ اس وقت تو ابا جی انکار نہ کر سکیں گے۔"

سرور سکتے میں آ گیا۔ اس نے اپنی انگلی کے ساتھ میز پر انتیس کا ہندسہ لکھا اور پھر اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی صفریں بنانے لگا۔ عطیہ اٹھ کر اس کے پاس سرک

آئی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اپنا گال اس کے سر پر رکھ دیا۔ سرور خاموش بیٹھا تھا۔ اس کی انگلی میز پر چھوٹے چھوٹے دائرے بنا رہی تھی اور عطیہ ہولے ہولے کہہ رہی تھی۔ "تم تو کہا کرتے تھے کہ تمہیں مجھ سے اتنا پیار ہے کہ تم میرے کسی حکم سے سر نہیں پھیر سکتے۔ اب تم خاموش کیوں ہو گئے؟ مَیں تمہارا انتظار کروں گی۔ تمہاری کار کا انتظار کروں گی جسے ابا جی کو دکھانے کے بعد ہم آگ لگا دیں گے۔ تمہاری پاس ٹبک دیکھنے کے لیے بے قرار ہوں گی جس کی ساری رقم ہم غریبوں میں تقسیم کر دیں گے—— اور—— اور"

سرور نے کچھ بولنا چاہا تو اس نے اسی طرح جھولا جھلاتے ہوئے کہا۔ "قطرہ قطرہ دریا ہو جاتا ہے۔ دانہ دانہ ہو کر کھتّے بھر جاتے ہیں اور پُھوئی پُھوئی سے جھیل تالاب بن جاتے ہیں۔ تم حوصلہ نہ ہارو۔ کوئی سی بھی نوکری کر لو۔ اللہ ضرور برکت دے گا—— پھر تم آنا سرور—— تم آنا—— میں تمہارا انتظار کرتی رہوں گی۔ تمہارا انتظار—— مجھے بھلا نہ دینا—— بھلانہ—— مجھے—— مجھے——"

اور پروانہ روشنی کی تلاش میں اڑ گیا۔

ایک دن شام کو جب غلام حسین ڈاک کا تھیلہ لے کر اسٹیشن چلا گیا اور بابو محمد دین کیش گنوا کر سیف میں بند کروا گیا۔ سرور نے اپنی ٹانگیں اٹھا کر کھڑکی میں رکھ لیں۔ جیب سے ایک روپیہ نکال کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ ایک طرف بادشاہ کی تصویر تھی، دوسری طرف عبارت لکھی تھی اور گول کنارے بے شمار آڑے نشان بنے تھے۔ اس نے ان نشانوں کو گننا شروع کیا اور تیس نشان گن کر تھک گیا۔ چٹکی پر روپیہ رکھ کر اس نے زور سے بجایا اور چھوٹے سے ڈاک خانے میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا۔ گرگٹ گرگٹ کوئی برقی پیغام گزر رہا تھا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور مورسکی والی میز پر جا بیٹھا۔ چھوٹے سے ڈبے میں ایک آہنی قلم دم توڑتی مچھلی کی طرح کٹ کٹ کرڑ کرڑ کٹ کٹ کر رہا تھا۔ اُس نے مُہر کو پیڈ پر ہولے سے دبایا اور ایک سفید کاغذ چھاپ کر روپیہ اس پر رکھ دیا۔ پھر اس نے روپیہ اٹھایا اور مُہر کے برابر رکھ دیا۔

بادشاہ اپنے سامنے چھپی ہوئی مُہر دیکھ رہا تھا۔ "ڈبوالی۔ ٹی۔ ای۔ ایل۔ 12 ستمبر۔" سرور نے اپنی الماری کھولی اور اس میں سے سیونگ بینک کی پاس ٹبک نکالی۔

اس پر ڈاک خانے کی مُہروں کے بے شمار نشان لگے تھے اور آخر میں پانچ سو لکھا تھا۔

تار کی برقی رو تھم گئی۔ سرور نے پاس بک بند کر کے وہی روپیہ اس کے اُوپر رکھ دیا اور کرسی کھینچ کر تار دینے لگا۔ اس کی ٹکٹکاہٹ کا اگلے ڈاکخانہ نے جواب دیا اور سرور نے پیغام بھیجنا شروع کیا ـــــ رول نمبر ایک سو بتیس ـــــ ایک سو بتیس ـــــ بتیس ـــــ پانچ سو ـــــ پانچ سو ایک ـــــ اگلے ڈاک خانے نے جھنجھلا کر جواب دینا بند کر دیا۔

پاس بک الماری میں رکھتے ہوئے اور روپیہ واپس جیب میں ڈالتے ہوئے اس نے سوچا۔ پتہ نہیں ڈاک خانے والے کیا سمجھتے ہوں گے۔ شاید میرے پاس استفسار کا خط بھیجیں۔ اس تار کے بارے میں اوپر رپورٹ کر دیں ـــــ یا شاید ـــــ یا شاید ـــــ لیکن یا شاید کچھ نہیں ـــــ کچھ نہیں ـــــ"

اسے سخت بھوک لگی تھی اور روپیہ وہ بھنوانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ روپیہ جب بھنوالیا جاتا ہے تو پھر وہ روپیہ نہیں رہتا! وہ اسی طرح اپنے کوارٹر میں جا کر لیٹ گیا اور عطیہ سے باتیں کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن عطیہ کا وجود اب دھندلا سا ہو گیا' نہ تو سرور اس سے کھل کر بات کر سکتا تھا اور نہ وہ پہلی سی محبت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی۔ ان کے درمیان جیسے نقرئی شیشے کی ایک چادر سی آ گئی تھی جو ذرا سی بات کرنے پر بھی جھنجھنا اُٹھتی تھی۔ ہڑیالوں کا شکار کرتے ہوئے مرغابیوں کے لیے ٹھنڈے پانی میں اترتے ہوئے ایسی بے شمار شامیں آئی تھیں جب وہ عطیہ سے دور ہوا کرتا تھا لیکن اس نے کبھی اُس دوری کو اس شدت سے محسوس نہ کیا تھا۔ پر اب تو بندوق بک جانے سے اور شکار کا شوق ختم ہو جانے سے اتنی دوری پیدا ہو گئی تھی کہ اپنے تخیل کی مدد سے وہ کبھی بھی اسے پاٹ نہ سکتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ مطمئن تھا کیونکہ وہ ایک ایسا پل تعمیر کر رہا تھا جو ان دونوں کو ملا رہا تھا اور ملنے کے بعد جسے وہ دونوں بھک سے اڑا رہے تھے۔

ڈاک خانے کے تینوں ڈاکیے اور بابو محمد دین اسے بے حد کنجوس خیال کرتے تھے اور جب بھی موقع ملتا وہ اس کی برائی کرتے۔ محمد حسین کو یقین تھا کہ وہ کسی کمینے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے جس نے کبھی روپے کی صورت نہیں دیکھی لیکن بابو محمد دین اس کی شکل و شباہت سے ہمیشہ یہی نتیجہ نکالا کرتا کہ وہ ضرور کسی اچھے خاندان سے

تعلق رکھتا ہے۔ اس کی ماں نے دوسری شادی کر کے اسے ہمیشہ کے لیے ذلیل بنا دیا ہے اور بابو محمد دین نے یہ نتیجہ اپنے علم کے زور پر نکالا تھا جو اس نے ڈاک میں آنے والے رسالوں کو کھول کھول کر پڑھنے سے حاصل کیا تھا۔

سیونگ بینک کے اندوختہ سے جب کوئی شخص کچھ رقم نکلوانے آتا تو بابو محمد دین آواز دے کر کہتا۔ "سرور صاحب یہ برادر پچیس روپے نکلوانے آئے ہیں، انہیں سمجھائیے۔" اور پھر ایک آنکھ میچ کر محمد حسین کو اشارہ کرتا۔ سرور اپنی کرسی سے اٹھتا اور کھڑکی کے پاس آ کر کہتا۔ "روپیہ کیوں نکلواتے ہو بھائی، پچیس روپے تو بہت ہوتے ہیں۔ سینکڑے کی ایک چوتھائی۔ روپیہ نکلواؤ نہیں جمع کراتے جاؤ۔ پھوئیوں پھوئیوں جھیل تالاب بن جاتے ہیں۔ دانہ دانہ مل کر کھتے بھر جاتے ہیں۔ دیکھو روپیہ نہ نکلواؤ۔ جمع کرو، جمع کرو۔ پھر تمہاری عزّت ہو گی۔ تمہارے خاندان کی عزت ہو گی۔ تمہارے قصبے کی عزّت ہو گی۔" اور وہ آدمی اتنی لمبی تقریر سُن کر گھبرا جاتا۔ سرور کی یہ تقریریں سارے قصبے کے لوگوں نے سن رکھی تھیں اور چونکہ وہ اس وعظ سے گھبراتے تھے، اس لیے انہوں نے سیونگ بینک میں روپیہ رکھنا بند کر دیا تھا۔

کبھی کبھار سرور اپنی کوٹھڑی میں اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک روپیہ جیب سے نکالتا اور اسے دونوں ہاتھوں کی چٹکیوں میں پکڑ کر ہولے سے کہتا۔ "ایک کے دو، دو کے چار، چار کے آٹھ، آٹھ کے سولہ ـــــ ہوں۔" لیکن جب وہ روپے کو زور سے کھینچتا' تو وہ پھسل کر کسی ایک چٹکی میں ایک کا ایک ہی رہ جاتا!

اوّل اوّل اس کے جی میں آتی تھی کہ سرکاری سیف کا روپیہ نکال کر بھاگ جائے۔ ایک کار خریدے اور اس میں روپوں کے توڑے رکھ کر گاؤں پہنچے اور سب کچھ بڑے پیرزادہ صاحب کے قدموں میں ڈال دے۔ بعد میں جو ہو سو ہو لیکن ایک دن جب وہ کیش گن رہا تھا اور نوٹوں کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا تو عطیہ نے روشندان سے آنے والی روشنی کے ساتھ اُتر کر اسے منع کر دیا تھا اور کہا تھا کہ اگر اس نے پھر اس قسم کی بات سوچی تو وہ اس کا انتظار کرنا بند کر دے گی اور شادی کر لے گی۔ اس کے بعد سرور نے بیگانے روپوں کو آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔

سیونگ بینک میں سرور کا حساب بڑی سُست روی کے ساتھ بڑھ رہا تھا اور

اب وہ سوچنے لگا تھا کہ ساری عمر میں بھی یہ رقم تیس ہزار کو نہ چھو سکے گی۔ اس پر بھی وہ بڑی مستعدی اور ثابت قدمی سے روپیہ جمع کر رہا تھا۔ مسلسل فاقوں سے اس کی صحت خراب ہو گئی تھی اور وہ بیمار سا رہنے لگا تھا لیکن پھر بھی وہ اوور ٹائم والی تاروں کے انتظار میں رات گئے تک کرسی پر بیٹھا رہتا۔ دانہ منڈی کے منیم بھاؤ کی تاریں لے کر اس کے پاس آتے۔ بڑے ادب سے سلام کرتے اور رسیدیں لے کر چلے جاتے۔

وہ ایک ایک کر کے ساری تاریں ٹکٹکاتا رہتا اور رات آدھی سے زیادہ بیت جاتی۔ خدا کا شکر تھا کہ ڈبوالی منڈی کے ڈاک خانے میں تعینات ہوا تھا جہاں آدھی تنخواہ سے زیادہ اوور ٹائم کی رقم بن جاتی تھی۔

ایک رات وہ ٹکٹوں والی صندوقچی کھولے رقم گن رہا تھا۔ باہر شدید بارش ہو رہی تھی اور ہوا کے تیز جھونکوں سے اس کا لیمپ بھڑک بھڑک اٹھتا تھا۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکنے کی کوشش کی لیکن کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ صندوقچی کے مختلف خانوں میں دوّنیاں، چوّنیاں، اٹھنیاں اور روپے پڑے تھے۔ وہ انگلی سے انہیں خانوں میں اِدھر اُدھر کر رہا تھا اور اس کے پہلو میں فٹ بھر اونچی پھٹکی پر ساؤنڈر گرگٹ گرگٹ کر رہا تھا۔ کہیں دُور سے —— نمبر کا 'شادی کی مبارکباد کا تار اس آلے سے ہوتا ہوا کسی اور شہر کو جا رہا تھا۔ کوئی دُور افتادہ شخص اپنے دوست عزیز الدّین کے نام پیغام بھجوا رہا تھا۔ ہپی میرج —— ہپی میرج —— اور سرور صندوقچی کے خانوں میں اٹھنیوں اور چوّنیوں کے ستون بنا رہا تھا اور اس کے پہلو سے تار گزر رہا تھا۔ ہپی میرج، ہپی میرج —— اس نے صندوقچی بند کر کے اس کی ٹھنڈی سطح پر اپنا گال رکھ دیا۔ ایک مرتبہ پھر باہر دیکھنے کی کوشش کی اور رحم طلب نگاہوں سے روشندان کی طرف دیکھ کر کہا۔

مجھے اٹھاؤ۔

مجھے اٹھاؤ —— میں زندگی کے خارزار میں گر گیا ہوں۔

اور میرا خون بہہ رہا ہے۔

ساؤنڈ میں آہنی قلم نفی میں سر ہلا رہا تھا اور برقی رو کہہ رہی تھی، گٹ گٹ گرگٹ، گر، گٹ ——

جس شام مہروں کا سال تبدیل کر کے محمد حسین نے کاپی پر انہیں چھاپا اور

سرور کے دستخط لینے کے لیے انہیں آگے بڑھایا تو اسے دو سال گزر جانے کا احساس ہوا۔ میز کی دراز سے اُس نے اپنی پاس بک نکالی اور بقایا پر نظر ڈالی۔ دو ہزار چار سو نواسی روپے۔ اس نے اسی قلم سے جس سے وہ کاپی پر دستخط کر کے ہٹا تھا بلاٹنگ پیپر پر انیس ہزار لکھا اور اسے دیر تک دیکھتا رہا۔ صفریں ٹویڈل ڈم اور ٹویڈل ڈی کی طرح پیٹ نکالے کھڑی تھیں اور نو کا ایمبریو جیسا ہندسہ ایک کے ساتھ سر لگائے جھکا ہوا تھا۔ سرور نے قلم میز پر رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ جس مقصد کے لیے اس نے یہ کچھ کیا ہے، آیا وہ اس کی زندگی میں پورا ہو بھی سکے گا یا نہیں اور اسے یوں لگا جیسے اس کی زندگی اس کام کے لیے بہت تھوڑی ہے اور اسے اپنی زندگی کے بعد بھی کئی سال اسی مقصد کے لیے سرگرداں رہنا پڑے' شاید وہ اسی قسم کی اور بہت سی باتیں بھی سوچتا' لیکن اسے اچانک یاد آ گیا کہ قطرہ قطرہ دریا ہو جاتا ہے۔ پھوئیوں پھوئیوں جھیل تالاب بن جاتے ہیں اور دانہ دانہ مل کر کھتے بھر جاتے ہیں۔

روپوں کے ساتھ روپے جوڑ جوڑ کر تو پاس بک کی رقم میں کوئی خاص اضافہ نہ ہوا لیکن دنوں پر دن گر گر تو سرور کی زندگی میں ایام کا ڈھیر سا لگ گیا۔ کبھی کبھی تو اس کے جی میں آتا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں سے بھاگ جائے اور پھر لوٹ کر نہ آئے۔ انہی پہاڑوں کے دامن میں جہاں اس نے اپنا بچپن اور جوانی بتائی تھی، ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنا کر گزر اوقات کرنے لگے' لیکن پھر اسے عطیہ کی باتیں یاد آ جاتیں۔ وہ اپنے سر کو جنبش دیئے بغیر اِدھر اُدھر نظریں گھما کر دیکھتا اور کہتا واقعی مرد کام کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور اگر وہ کام نہ کریں تو کچھ اچھے نہیں لگتے اور وہ اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ دن بھر لمبی لمبی رقمیں جوڑ کر شام کو گوشوارہ بنا کر اور ڈاک کا تھیلہ بند کروانے کے بعد وہ بنچ پر بیٹھ جاتا اور جب تھکن کا احساس اسے بالکل چور کر دیتا تو اس کا جی عطیہ کو خط لکھنے کو چاہتا اور وہ رول نمبر 132 کے نام ایک خط بھی لکھ دیتا لیکن پھر اسے دیئے کی لو پر جس طرح لاکھ پگھلا کر مہریں لگائی جاتی ہیں، وہ اس خط کو جلا دیتا۔ جلے ہوئے کاغذ کا سیاہ بل فرش پر اِدھر اُدھر گھومتا اور پاؤں تلے دب جاتا۔

مہروں کی تاریخیں بڑی تیزی سے بدل رہی تھیں۔ مہینے بدل رہے تھے اور کسی شام سال بھی تبدیل کر دیا جاتا۔ سرور نااُمید نہیں ہوا۔ روپے سے اس کو محبت

نہیں ہوئی پر روپیہ جمع کرنا اس کی فطرت میں داخل ہو گیا۔ اسے یوں لگتا جیسے پیسہ پیسہ جوڑتے کتنی صدیاں گزر گئی ہیں۔ کئی جگ بیت گئے ہیں مگر وہ گاڑی جس پر سوار ہو کر اسے منزلِ مقصود تک پہنچنا ہے، ابھی تک پہیوں کے بغیر ہی ہے۔

مگر ایک شام جب غلام حسین ڈاک کا تھیلا لے کر اسٹیشن چلا گیا تھا اور ڈاک خانے کی ساری کھڑکیاں بند ہو گئی تھیں اور تار کا ڈبہ سارا دن ٹرٹرانے کے بعد خاموش ہو گیا تھا، سرور کو نہ جانے کیوں پان کھانے کی تمنا ہوئی۔ اس بند کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے سامنے سگرٹوں کی دکان کو دیکھا۔ لڑکا پان لگا رہا تھا۔ بائیسکلوں کا مستری ٹین کی کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور گراموفون بج رہا تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نقدی باہر نکالی۔ کُل تین روپے بارہ آنے تھے۔ بارہ آنے ڈاک خانے کے تھے اور تین روپے اس کے اپنے۔ بارہ آنے ٹکٹوں والی صندوقچی میں ڈال کر وہ ڈاک خانے سے باہر نکلا اور سگریٹوں والے کی دکان کے پاس جا کھڑا ہوا لیکن فوراً ہی اسے خیال آیا کہ یہ تو ایک آنے کا پان دیتا ہے اور اسٹیشن پر دو پیسے کا ملتا ہے۔ اس نے مسکرا کر لڑکے سے پوچھا۔ "کوئی نیا ریکارڈ نہیں منگوایا؟"

لڑکے نے کتھا لگاتے ہوئے جواب دیا۔ "چاچا گیا ہوا ہے۔ میں نے اسے نئے ریکارڈوں کے لیے کہا تو تھا۔ اگر پیسے بچ گئے تو ضرور لائے گا۔"

سرور نے ہولے سے کہا۔ "ہاں پیسے تو ضرور بچانے چاہئیں۔ وقت بے وقت کام آتے ہیں۔ مصیبت میں مدد کرتے ہیں۔"

لڑکا اسی طرح کتھا لگاتا رہا اور سرور اسٹیشن کو روانہ ہو گیا۔

اندھیرا چھا رہا تھا۔ اسٹیشن کے کمروں میں لیمپ روشن ہو گئے تھے اور پلیٹ فارم کے گیسوں کو بانس سے نیچے ڈھلکا کر ان میں تیل بھرا جا رہا تھا۔ غلام حسین ڈاک کے تھیلے کو گود میں لیے بنچ پر بیٹھا گاڑی کی راہ تک رہا تھا۔ سرور کو قریب آتے دیکھ کر وہ کھڑا ہوا گیا تو سرور نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ "بیٹھیے بیٹھیے، تکلّف کی کوئی ضرورت نہیں۔" چھابڑی والے برآمدے سے نکل کر باہر پلیٹ فارم پر آ گئے تھے اور ان کے خوانچوں میں کاربائیڈ کے لیمپ خاموشی سے لو دیئے جاتے تھے۔ سرور کا جی آج سیر کرنے کو چاہتا تھا اور وہ پان کھا کر ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ ندی کی طرف نکل آنا

چاہتا تھا لیکن جب سگنل کی سرخ آنکھ سبز ہو گئی تو اس نے سوچا کہ کیوں نہ ایک نظر گاڑی کا نظارہ کرتے چلیں۔ بڑی دور شبنم اور ببولوں کے جھنڈ سے پرے گاڑی کی روشنی نمودار ہو رہی تھی اور اس کے دھیمے دھیمے وسلوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سرور پان والے کے پاس گیا اور اچھے سے پتّے کا انتخاب کرنے لگا۔ اس نے سارے لگے ہوئے پتوں کی کوریں موڑ کر دیکھیں مگر اسے کوئی پتہ پسند نہ آیا۔ تسلے میں پڑے ہوئے پتوں میں سے ایک پتا اس نے چھانٹ کر نکالا۔ بڑا خستہ پتا تھا۔ اس نے کلفی میں لکڑی گھمائی اور خود ہی چونا لگانے لگا۔ گاڑی کی دھمک قریب آتی جا رہی تھی اور اس کی شٹرنک شٹرنک صاف سنائی دے رہی تھی۔ پان لگا کر اس نے روپیہ چھابڑی والے کی طرف بڑھایا۔ ایک لمحے کے لیے پان فروش نے روپے کو غور سے دیکھا اور پھر اپنی صدری سے نادان نکالنے لگا۔ ایک چونّی، ایک دونّی، ایک آنہ اور ایک ادھنی دے کر اس نے دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا اور اٹھنی نکالی۔ سرور کے ہاتھ میں اٹھنی دیتے ہوئے اس نے گاڑی کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اسے اُدھر دیکھتے ہوئے پا کر سرور بھی اُدھر دیکھنے لگا۔ اٹھنی کا ایک کنارہ سرور کے ہاتھوں سے چھوا، پھر وہ پلیٹ فارم کی سل پر گری، بجی، اچھلی اور پھر لائن میں گر گئی۔ سرور اس کے پیچھے لپکا اور پلیٹ فارم کے نیچے اُتر گیا۔

گاڑی بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ اٹھنی پتھروں میں جا چھپی تھی۔ لوگ پلیٹ فارم پر شور مچا رہے تھے۔ انجن فلک شگاف وسل دے رہا تھا اور سرور پتھروں کو بڑی تیزی سے ہٹائے جاتا تھا۔ ایک دم ویکیوم لگ جانے سے گاڑی کے پہیوں سے بڑی خوفناک آوازیں نکل رہی تھیں۔ گاڑی روکے سے رک نہیں رہی تھی۔ ساری دھرتی کانپنے لگی۔ سرور پسینے میں نہا گیا۔ انجن کا نجار اسے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ انجن کی چندھیا دینے والی روشنی جب لائن پر پڑے ہوئے پتھروں پر پڑتی تو سرور کو ہر سنگریزے کے ساتھ اٹھنی چمٹی ہوئی دکھائی دیتی۔ وہ ہر سنگریزے کی طرف بھاگتا، ہر اٹھنی کی طرف لپکتا اور ہر کرن پر ٹوٹ کر گرتا۔ روشنی! روشنی!! روشنی!!! پروانے سرگوشیاں کر رہے تھے اور کھرنک کھرنک کھڑ کھڑ ——— کھڑڑنک ——— ڑنک ——— کھڑڑنک ——— نک ڑڑ ——— رکتا ہوا انجن سرور کی طرف بازو پھیلائے بڑھ رہا تھا ——— کھڑڑنک ——— ڑنک ——— کھڑڑنک ——— ن ——— ن ——— ک ——— ڑڑن ک۔

حقیقت نیوش

میری بچیو! سعدیٰ کی سہیلیو! میرے قریب آؤ اور سنو! یہ کمبل میری ٹانگوں پر ڈال دو اور آتشدان میں چند لکڑیاں اور جھونک دو۔ آج میں تمہیں وہ بات سنانے لگا ہوں جو تم نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنی۔ اور جب میری زبان ہمیشہ کے لیے گُنگ ہو جائے گی تو پھر تمہیں کوئی بھی ایسی بات نہ سنا سکے گا۔ بتی بجھا دو اور آخری کھڑکی کھول دو۔ آج مجھے یوں لگتا ہے جیسے میری بینائی لوٹ آئی ہے۔ جیسے مجھے دکھائی دینے لگا ہے اور جیسے مجھے تمہارے خدوخال نظر آنے لگے ہیں لیکن تم اس طرح کیوں بیٹھ گئی ہو۔ تم نے تو میری کرسی کے گرد پجارنوں کی طرح آسن جما لیے ہیں۔ بستر سے تکیے اٹھا لاؤ۔ میرا لحاف لے لو اور یوں بیٹھو کہ مجھے پتہ نہ چلے۔ تم میں سے کوئی بیٹھے، کوئی لیٹ جائے، کوئی نیم دراز ہو اور کوئی اپنی دونوں کہنیاں زمین پر ٹیک کر ہتھیلیوں کے پیالے میں اپنی ٹھوڑی ڈال لے۔ تمہارے اس طرح بیٹھنے سے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ مَیں ایک سکول ماسٹر ہوں جس نے چھٹی کے بعد بچّوں کو گرائمر پڑھانے کے لیے روک رکھا ہو——! دیکھو! جس ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کھڑکی سے لپک لپک کر اندر آرہے ہیں، عین اسی طرح میری برسوں کی بوڑھی اور ٹھنڈی جان بھی اسی کھڑکی کے راستے باہر نکل جائے گی اور جب میں اس کھڑکی سے اس وجود سے باہر نکل جاؤں گا تم روؤ گی، چیخو گی، چلّاؤ گی اور اپنے بوڑھے دادا کو پکارو گی، پر مَیں واپس نہ آؤں گا اور ٹھنڈی روح ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ گھُل مل جائے گی لیکن اس وقت مجھے کمبل اوڑھا دو اور آتشدان میں لکڑیاں ڈالتی چلی جاؤ کیونکہ میں ابھی تک گیا نہیں اور تم سے باتیں کیے بغیر میں جاؤں گا بھی نہیں۔ سنو! یہ کائنات نامکمل ہے، انسان نامکمل ہے اور سب سے

بڑھ کر اس کی زبان نامکمل ہے۔ اگر سوچنے والے دماغ ہوتے۔ اگر پُر معنی الفاظ ڈھل چکے ہوتے تو جمیل کی زندگی یوں نہ گزرتی۔ جمیل مجھے کس قدر عزیز ہے، یہ سعدیٰ جانتی ہے اور اس کے بارے میں اس نے تمہیں بہت کچھ بتایا ہے۔ باقی جو رہ گیا ہے، وہ میں سنائے دیتا ہوں لیکن یہ بات تم ذرا دھیان سے سننا۔ ویسے ہی دھیان سے جیسے سعدیٰ میری میز پر بیٹھ کر خط لکھا کرتی ہے اور نہیں جانا کرتی کہ کیا لکھ رہی ہے اور کیوں لکھ رہی ہے۔ بس اسی طرح تم بھی میری باتوں کو سننا، یہ نہ جانتے ہوئے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کیوں کہہ رہا ہوں کیونکہ جب تم اس طرح بات سنتی ہو تو اس کا ایک ایک لفظ تمہارے ذہن پر مرتسم ہو جاتا ہے اور تم اسے بھلانے پر بھی نہیں بھلا سکتی ہو کہ فطرت نے تمہیں اس طرح سے ڈھالا ہے!

جمیل اور مَیں بچپن کے ساتھی تھے اور وہ اپنے آپ کو اتنا بہت جانتا تھا جس قدر مَیں اسے پہچانتا تھا۔ وہ برہمن النسل تھا اور اس کی آنکھوں میں پنڈتوں کی ودّیا کی جوت تھی۔ اس کے بال سنہرے تھے اور اس قدر پیچ دار تھے کہ کنگھی کے باریک دندوں والا حصہ ان میں چل نہ سکتا تھا۔ مکتب کے زمانے میں وہ گلہری کی سی پُھرتی سے درختوں پر چڑھ کر پرندوں کے گھونسلوں کو اجاڑا کرتا اور ان سے نیلے اور چتکبرے انڈے نکال کر مجھے دیا کرتا۔ ان انڈوں کو ہم سرگوں میں بھگو کر گیندوں کی طرح لچکدار بنا لیتے اور پھر تنگ منہ کی بوتلوں میں اتار دیا کرتے۔ بوتل میں برف کا ٹھنڈا پانی ڈالنے سے وہ انڈا پھر اپنی اصلی حالت پر آجاتا اور دیکھنے والے حیران رہ جاتے کہ یہ بوتل میں اترا کیونکر۔ میرے کمرے میں ایسی بہت سی بوتلیں جمع ہو گئی تھیں۔ الماری میں بریکٹ پر، چارپائی کے نیچے اور کتابوں والے بڑے میز پر بیسیوں ایسی بوتلیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ ایک دن اچانک جمیل نے گھونسلے اجاڑنے چھوڑ دیئے اور وہ درخت پر چڑھنا بھول گیا۔ مَیں نے پوچھا تو اس نے کہا، مجھے ڈر لگتا ہے کہ کسی دن کوئی انڈا بوتل میں ہی نہ چیخ جائے اور اس میں سے چڑیا کا ایک ننّھا سا بچّہ نہ نکل آئے۔

میں نے کہا ”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اس میں ڈر کیا؟“

جمیل نے پریشان ہو کر کہا۔ ”لیکن وہ بچّہ بڑا کیسے ہوگا، اس کو چوگا کون دے گا اور پھر وہ اس بوتل میں سے نکلے گا کیسے؟“

اس پر مجھے بڑی ہنسی آئی اور میں نے اس کا کندھا تھپک کر کہا۔ "اسے ہم چوگا کھلائیں گے اور وہ اسی بوتل میں بڑا ہو جائے گا اور جب ہمارا جی اسے باہر نکالنے کو چاہے گا تو ہم وہ بوتل توڑ ڈالیں گے۔" اس پر تھوڑی دیر کے لیے اسے اطمینان ہو گیا لیکن پھر فوراً ہی گھبرا کر کہا۔ "یہ تو ٹھیک ہے پر یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ہم کوئی بوتل کہیں رکھ کر بھول جائیں۔ انڈے سے بچّہ نکلے اور پھر تڑپ تڑپ کر بوتل ہی میں مر جائے۔" اس پر مجھے ہنسی آ گئی اور میں نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "فکر مت کرو۔ اول تو ہم بھولتے نہیں اور اگر بھول بھی گئے تو وہ بچّہ چیوں چیوں کر کے ہمیں خود بلائے گا۔" لیکن اس کی تسلی نہ ہوئی اور اس نے درختوں پر چڑھنا اور گھونسلے نوچنا چھوڑ دیا۔

ذرا ٹھہرو میری پیاری بچیو! میں تمہیں اپنے بچپن کے سارے واقعات کیوں سناؤں۔ تمہیں اپنی زندگی کی ساری داستانیں کیوں سناؤں؟ وقت بہت کم ہے اور رات گزرتی جا رہی ہے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اور آتشدان کی حدّت مل جل کر تمہیں اپنی کنگنی گود میں لوریاں دے رہے ہیں اور تم جمائیاں لینے لگی ہو۔ میں تمہیں صرف چند واقعات بتا کر اپنا بوجھ ہلکا کر لوں گا۔ پھر تم انہیں جوڑ کر آپ ہی ایک داستان مرتب کر لینا۔ جمیل کسی کی بات ٹال نہ سکتا تھا۔ کسی کو کھرا جواب نہ دے سکتا تھا اور کسی کو منہ پھاڑ کر "نہیں" نہ کہہ سکتا تھا۔ اگر وہ نہ کہنے کا عادی ہوتا یا اس میں سر ہلا کر انکار کر دینے کی جرأت ہوتی تو آج تم سب کو جمع کر کے اس کی کہانی بیان نہ کرتا۔ جمیل دراصل وہ نہ تھا جو دنیا اسے سمجھتی رہی۔ وہ دراصل وہ تھا جس کے لیے کسی زبان میں کوئی لفظ نہیں ملتا اور جس کی وضاحت کے لیے کوئی ترکیب یا بندش ڈھالی نہیں جا سکتی۔

دسویں جماعت میں اسے اپنی بنتِ عم سے بڑی خطرناک قسم کی محبت ہو گئی اور وہ ہر لحظہ پریشان رہنے لگا۔ اس نے اس کی یاد میں تڑپا دینے والے شعر لکھے۔ اس کی تعریف میں لمبی لمبی نظمیں لکھیں۔ لیکن ان دونوں کو دائمی رفاقت میسّر نہ آئی۔ قصور ایسے چھوٹے سے شہر میں زبیدہ اور اس کی امی اپنے آبائی مکان میں زندگی گزار رہی تھیں اور زبیدہ کا بھائی جو فیروزپور آرسنل میں ایک معمولی کلرک تھا، ان کی کفالت کرتا تھا۔ ان کے کسی قریبی عزیز کی شادی تھی اور یہ دونوں کنبے ہوشیارپور جا رہے تھے۔ جمیل کے ابا نے مناسب سمجھا کہ وہ قصور سے ہوتے ہوئے چلیں اور اپنی بھاوج

کو بھی ساتھ لیتے جاویں۔ جب یہ لوگ لاہور سے بس کے ذریعے قصور پہنچے تو گاڑی کے روانہ ہونے میں تھوڑی ہی دیر تھی۔ انہوں نے جلدی جلدی زبیدہ اور اس کی امی کو تیار کیا۔ ایسی جلدی میں چونکہ زبیدہ کے پاس کوئی سینڈل نہ تھا، اس لیے اسے چپلی پہن کر ہی اسٹیشن آنا پڑا۔ اس کی امی نے بازار میں ایک دکان پر تانگہ رکوایا بھی، پر جمیل کے ابا یہ کہہ کر کہ ہوشیارپور چل کر سینڈل خرید لیں گے، انہیں شاپنگ کرنے کی اجازت نہ دی۔ چونکہ یہ لوگ سیکنڈ کلاس میں سفر کر رہے تھے، اس لیے زبیدہ سارا وقت سیٹ پر اکڑوں بیٹھی رہی اور اس نے اپنے پاؤں سیٹ کے نیچے چھپائے رکھے۔ جالندھر سٹیشن پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ہوشیارپور والی گاڑی دو گھنٹے بعد روانہ ہو گی۔ زبیدہ کی امی نے جمیل کے ابا سے درخواست کی کہ وہ زبیدہ کو بازار لے جا کر سینڈل خرید دیں۔ انہوں نے درد کرتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر یہ ڈیوٹی جمیل کے سپرد کر دی۔ جب وہ دونوں سٹیشن سے باہر نکلے تو جمیل کے پاس چچی کا دیا ہوا پانچ روپے کا نوٹ تھا۔ گرہ سے کھولتے وقت چچی نے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ سینڈل چار ساڑھے چار روپے سے زیادہ کا نہ ہو اور تانگے کا کرایہ بھی اسی میں سے ادا کیا جائے! جب وہ تانگے پر سوار ہوئے اور جمیل بھی زبیدہ کے پاس پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تو زبیدہ کونے میں سمٹ گئی۔ تھوڑی دور جا کر جمیل نے کہا۔ "تم بھی میری امی جیسا ریشمی برقع کیوں نہیں پہنتی ہو؟ یہ تو مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔" زبیدہ نے ہولے سے کھنکار کر گلا صاف کیا لیکن کوئی جواب نہ دیا اور جب وہ بازار میں داخل ہو گئے تو جمیل نے کہا۔ "جب میں نوکر ہو جاؤں گا تو تمہارے لیے اچھے اچھے سینڈل لایا کروں گا اور——"

زبیدہ نے ہولے سے جواب دیا۔ "اس وقت تو آپ ہمیں بھول جائیں گے اور اگر اس وقت آپ نے مجھے سینڈل لا کر دیئے تو آپ کی بیوی بہت ناراض ہوا کریں گی۔"

جمیل نے ہنس کر کہا۔ "اگر سینڈل لانے پر بھی ناراض ہوئی تو ہوا کرے۔ ایک تو اس کے لیے سینڈل لاؤ، دوسرے اس کی ناراضگی برداشت کرو۔"

زبیدہ نے کہا۔ "وہ—وہ—ایک دکان وہ سامنے ہے۔"

انہوں نے تانگہ رکوایا اور دکان میں داخل ہو گئے۔ نرم چمڑے کا گندھا ہوا

ایک سینڈل زبیدہ کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ وہ بار بار اسے دیکھتی، پہنتی اور پھر وہ فرش پر رکھ دیتی۔ لڑکا اسے کئی جوتے دکھا چکا تھا۔ پر اس کی طبیعت کسی پر نہ جمتی تھی۔ اس نے اسی گندھے ہوئے سینڈل کو اٹھا کر کہا۔ ''نزہت کے پاس بھی یہ ہی ہے لیکن اس نے تو یہ بارہ روپے میں خریدا تھا۔'' پھر اس نے سیاہ رنگ کی ایک گرگابی پہن کر پوچھا۔ ''اس کی کیا قیمت ہے؟''

''ساڑھے چار روپے۔'' لڑکے نے اس پر کپڑا پھیر کر کہا۔

''بس یہ ہی ٹھیک ہے۔'' زبیدہ نے مجبور نگاہوں سے جمیل کی طرف دیکھا اور گرگابی اتار دی۔ جمیل اٹھ کر دکاندار کے پاس چلا گیا۔ دکاندار نے لڑکے کو ڈبوں کے انبار اندر لانے کو کہا اور جب جمیل قیمت ادا کر کے اور ڈبہ لے کر باہر نکلا تو اس کے قدم اصیل مرغ کی طرح پڑتے تھے اور زبیدہ اس کے ساتھ بہت چھوٹی سی دکھائی دیتی تھی۔ تانگے میں بیٹھ کر اس نے ڈبہ زبیدہ کے حوالے کیا اور کہا۔ ''لو دیکھو، میری بیوی کوئی ناراض ہوئی ہے؟''

زبیدہ نے اسے کھولتے ہوئے کہا۔ ''اب تو وہ ہے ہی نہیں، اگر ہوتی تو—''

اس پر جمیل ہنس پڑا۔ ''ہے ہی نہیں—ہاہا—ہے کیوں نہیں بھلا۔''

اور جب ڈھکنا کھلا تو ڈبے میں نرم چمڑے کا گندھا ہوا سینڈل پڑا تھا۔ زبیدہ نے کچھ کہنا چاہا تو جیسے اس کی زبان رک گئی۔ رینک بازار کے بیچوں بیچ نہ جانے جمیل کے دل میں کیا آئی کہ اس نے زبیدہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''اگر شادی کروں گا تو تم ہی سے کروں گا۔ نہیں تو کروں گا ہی نہیں۔''

زبیدہ نے ہاتھ چھڑانا چاہا اور اس کی انگلیاں جمیل کے ہاتھوں سے لپٹ گئیں!

لیکن سعدی میری بچی! یہ کمرہ تاریک سا کیوں ہو گیا ہے۔ شاید تم نے آتشدان میں لکڑیاں جھونکنی چھوڑ دی ہیں۔ شاید تمہیں نیند آ رہی ہے اور تم اونگھنے لگی ہو۔ میں کیا کروں اور تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ آج کے بعد میں تم سے ہمکلام نہ ہوں گا۔ پھر نہ تم میری آواز سن پاؤ گی، نہ مجھے پکار سکو گی اور تم اتنی ہی جاہل رہ جاؤ گی جتنی کہ تم عام طور پر ہوا کرتی ہو۔

جب ہم کالج میں پڑھا کرتے تھے تو ایک دن جمیل کو زبیدہ کا خط ملا کہ وہ اپنی

امی کے ساتھ پنڈی جا رہی ہے۔ اس لیے جمیل اسے اسٹیشن پر آ کر ملے۔ گاڑی شام کے وقت لاہور سے گزرتی تھی لیکن شام سے پہلے ہی اس کے ابا نے اسے اپنے کرایہ داروں کے کرایہ نامے لکھنے پر لگا دیا۔ وہ ایک کرایہ نامہ لکھ کر اپنے ابا کی طرف دیکھتا۔ گھڑی کی طرف دیکھتا اور جیب کی طرف دیکھتا جس میں زبیدہ کا خط تھا' مگر وہ اتنا نہ کہہ سکا کہ ابا میں اس وقت یہ کرائے نامے نہیں لکھ سکتا۔ اب یہ دستاویزات تحریر نہیں کر سکتا۔ انہیں کسی اور وقت پر اُٹھا رکھیے۔ انہیں کسی اور سے لکھوا لیجئے۔ اس کا دل کہہ رہا تھا نہیں! نہیں!! نہیں!!! اور اس کا ہاتھ چل رہا تھا۔ ''میں اقرار کرتا ہوں کہ آج مورخہ—'' وقت گزر گیا، گاڑی نکل گئی اور اس کا قلم چلتا رہا— تیسرے دن اسے زبیدہ کا مختصر سا خط ملا۔ ''تم بڑے بے وفا ہو جمیل۔'' اور وہ میرے پاس آ کر رو پڑا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بے وفا نہیں ہے۔ بے ایمان نہیں، جھوٹا نہیں لیکن وہ کیا تھا؟ اس کا مجھے علم نہ تھا۔ اس وقت میں بھی تمہارے جیسا تھا۔ تم جتنا تھا اور میرا ذخیرہ الفاظ محدود تھا۔ پر اب میں جان گیا ہوں وہ کیا کیا تھا۔ جمیل بے وفا نہیں تھا یزفیک تھا اور اب میری پیاری بچیو تم مجھ سے پوچھو گی کہ یزفیک کیا ہوتا ہے لیکن اس کے معنی مجھے خود بھی معلوم نہیں۔ پر تم اتنا کیا کرو کہ کسی مرد کو بے وفا کہنے سے پہلے یہ سوچ لیا کرو کہ وہ یزفیک تو نہیں۔ کہیں وہ جمیل تو نہیں۔ شاید وہ یزفیک ہو اور تم اسے بے وفا سمجھتی رہو، سنگدل سمجھتی رہو، ہری چگ سمجھتی رہو۔

کالج کے زمانے میں جہاں اور بہت سی لڑکیاں ہماری ہم سبق تھیں، ایک نجمہ بھی تھی۔ اس کی باتوں میں کچھ ایسا جادو تھا کہ جو کوئی ایک لمحے کے لیے اس سے ملتا، اس کا گرویدہ ہو جاتا لیکن وہ لڑکی بڑی خود سر قسم کی تھی۔ اس نے باتوں میں کسی کی حوصلہ افزائی نہ کی تھی۔ کسی کو لفٹ نہ دی تھی لیکن وہ اور جمیل کتابوں کی باتیں کرتے کرتے کچھ اور طرح کی گفتگو کرنے لگے اور ایک دن جب جمیل میرے پاس آیا تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور اس کے سنہرے بال کھلے ہوئے سے تھے۔ اس نے مجھے بتایا کہ تمام رات جاگتا رہا اور اپنے اللہ سے دعائیں مانگتا رہا اور جب آدھی رات ہوئی تو اس کے دل میں زبیدہ کی موت کی دعا اٹھی اور اسے رونا آ گیا۔ وہی زبیدہ جس کا ہاتھ تھام کر اس نے رینک بازار کے بیچوں بیچ وعدہ کیا کہ اگر شادی ہو گی تو اسی سے ہو گی

ورنہ نہیں ہو گی۔ زبیدہ کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ اس کے خطوط اس کے ذہن میں ابھرنے لگے اور وہ پچھتانے لگا کہ اس کی ملاقات زبیدہ سے کیوں ہوئی۔ سیدھی نجمہ سے کیوں نہ ہو گئی! لیکن اس میں نہ تو زبیدہ کا قصور تھا اور نہ نجمہ کا اور نہ ہی جمیل کا۔ یہ سارا کیا دھرا تو ملاقات کا تھا جو ہو جایا کرتی ہے اور ہوتی رہتی ہے جس کی راہ میں چناب ایسی ندیاں تو کیا اگر بڑے بڑے سمندر بھی آ جائیں تو بھی اس کا سلسلہ ٹوٹا نہیں کرتا۔ دسمبر کی ایک یخ بستہ رات کو جب جمیل اپنے آپ کو سزا دینے کے لیے ساری رات صرف ایک نیکر پہن کر کوٹھے پر بیٹھا رہا تو مجھے اس کی بہت فکر ہوئی اور میں نے بڑی منتوں اور سماجتوں کے بعد اس سے نجمہ کے نام ایک خط لکھوایا کہ مجھے زبیدہ سے محبت ہے اور میں نے اس سے عہد و پیمان کر رکھے ہیں۔ میں اسے دھوکا دینا نہیں چاہتا اور آپ کو بھی بہلاوے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ مجھے آپ سے محبت ہے۔ مجھے اس سے بھی محبت ہے اور میں کسی کو نہیں چھوڑ سکتا اور اب میں نے تمام عمر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ شاید اس طرح سے میں اپنا عہد نباہ سکوں۔

لیکن میری پیاری بجیو! نجمہ نے اس خط کا جو جواب دیا وہ بڑا تکلیف دہ تھا اور اس نے بھی اسی غلطی کا اعادہ کیا تھا جو تم ازل سے کرتی آئی ہو۔ سعدیٰ بیٹی یہ کمبل کا کنارہ میرے پاؤں تلے دے دو اور میری الماری سے وہ سیاہ صندوقچہ اٹھا لاؤ جس میں جمیل کے نام آئے ہوئے سارے خط موجود ہیں مگر ٹھہرو! تم بس یہ کنارہ ہی میرے پاؤں تلے دبا دو اور اس صندوقچہ کو رہنے دو۔ میں تمہیں وہ خط زبانی سناتا ہوں۔ مجھے وہ سارے خطوط حفظ ہو گئے ہیں اور میں انہیں بے ہوشی کی حالت میں بھی دہرا سکتا ہوں۔ نجمہ نے جواب دیا۔ "مجھے تم سے اس چیز کی توقع نہ تھی۔ ظاہری صورت سے تم ایسے دکھائی نہیں دیتے ہو، لیکن باطن کی خباثت جو خدا جانے اور کس کس کو آلودہ کرے گی، مجھ پر آج عیاں ہوئی۔ تم نے مجھے دھوکا دیا، زبیدہ کو دھوکا دیا اور محبت جیسے پاکیزہ لفظ کو ایکسپلائٹ کیا۔ اگر تم یہ سب جانتے تھے تو مجھے پہلے ہی کیوں نہ بتایا ــــ؟ آغاز ہی میں مجھ پر ساری باتیں کیوں روشن نہ کر دیں اور شروع ہی میں مجھے اپنی زبیدہ کی کہانی کیوں نہ سنائی؟ تمہاری بے وفائی کا داغ میرے سینے میں ساری زندگی انگارے کی طرح دہکتا رہے گا۔ تمہاری ہرجائیت میری زندگی میں پھانس کی طرح کھٹکتی رہے گی اور تمہارا

وجود میرے لیے ایک چلتا پھرتا جھوٹ، ایک جیتا جاگتا فریب بن کر رہ جائے گا۔ اس کے بعد مجھے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔"

لیکن میری پیاری بجیو! وہ بے وفائی نہیں تھی، یز فیکتا تھی۔ جمیل جھوٹا یا فریبی نہیں تھا۔ وہ یز فیک تھا۔ اور اسے اپنی اور نجمہ کی محبت کا آغاز اس وقت معلوم ہوا تھا جب وہ آغاز نہیں کر رہا تھا اور اے میری سعدیٰ کی سہیلیو! محبت کسی خاص تاریخ کو شروع نہیں ہوتی۔ دل موسم کے چھان بین کا دفتر نہیں ہوتا اور ــــ اور چاہت فرسٹ یا سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ نہیں ہوتی جس پر سفر کی تاریخ پہلے ڈال دی جاتی ہے۔ پھر بھلا آغاز کیا اور انجام کیا؟ لیکن اس وقت میں بھی یہ باتیں سوچ نہ سکتا تھا۔ مَیں بھی یہ رمزیں سمجھنے سے عاری تھا ورنہ نجمہ سے ضرور پوچھتا کہ بھلا اس نے کسی جولائی کی انیس یا کسی اگست کی سات تاریخ کو صبح کے ساڑھے دس بجے یا شام کو پونے چار بجے جونہی اس کی محبت شروع ہوئی، جمیل سے یہ کیوں نہ پوچھ لیا کہ اسے کسی اور سے محبت تو نہیں؟ اور میری بجیو! محبت ریڈیو کا پروگرام نہیں جو گجر بجنے پر شروع ہو جاتا ہے اور جس کی تفصیل پندرہ دن پہلے بتا دی جاتی ہے۔ نجمہ کے یہ لکھنے پر کہ اس کے بعد مجھے ملنے کی کوشش نہ کرنا، جمیل نے وہ شہر ہی چھوڑ دیا اور پُونا جا کر ایک انگریزی فرم میں ملازم ہو گیا۔ اپنے کام کے علاوہ وہ اپنے کلرکوں کا کام بھی کرتا۔ اپنے منیجر کی ذمہ داریاں سنبھالتا اور وقت پڑنے پر اپنے چپڑاسی کے فرائض بھی خود ہی انجام دے لیا کرتا۔ وہ بے حد میٹھا آدمی تھا۔ سادہ لوح انسان تھا اور اس کا دل ذرا ذرا سی بات پر پسیج جایا کرتا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سارے جہان کے درد اکٹھے کر کے انہیں اپنے دل میں رکھ لے۔ انہیں اپنے تنفس کی ہوا دیتا رہے اور جب وہ لَو دے اٹھیں تو اس کا چھوٹا سا وجود جل جائے۔ لیزک واٹ اینڈ برادرز میں کام کرتے جب اسے ایک عرصہ گزر گیا تو وہ اپنا وطن بھول گیا۔ اپنا شہر بھول گیا اور اس نے اپنے سارے دوستوں کو بھلا دیا۔ ایک ہفتہ کے روز جب دفتر آدھے دن کے بعد بند ہو گیا تو اس نے مس تیلما کو چند ضروری کاغذات ٹائپ کرنے کے لیے روک لیا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا پچھلے مہینے کی کارگزاریوں کا خلاصہ تیار کرتا رہا اور تیلما برآمدے کے آخری کونے پر لکڑی کے کابک میں ٹائپ کرتی رہی۔ کوئی گھنٹے بھر کے بعد جب وہ کاغذات کا پلندا لے کر آئی تو اس نے اپنا چھوٹا سا رومال ماتھے پر پھیرا

اور کاغذات کا مٹھا جمیل کو دے کر کہنے لگی۔ "میں بہت تھک گئی ہوں اور میرے سر میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا ہے۔ کیا میں اس کرسی پر بیٹھ کر ذرا سستا لوں؟"

"ضرور ضرور۔" جمیل نے پائپ منہ سے نکال کر کہا۔ "میں یہ چند سطریں لکھ لوں اس کے بعد ہم ریستوان میں چل کر چائے پیتے ہیں۔"

تیلما نے آنکھیں بند کر کے اپنا ماتھا کرسی کی پشت پر رکھا ہوا تھا۔ یہ بات سُن کر اس نے اپنے پپوٹے جھپکے اور اسی طرح سر رکھے کہا "مجھے ریستوران جانا اچھا نہیں لگتا اور اگر مجھے جانا بھی پڑے تو مَیں اکیلی جاتی ہوں۔"

جمیل نے کہا۔ "پھر چائے یہیں منگوا لیتے ہیں۔ اس طرح کام بھی جلدی ختم ہو جائے گا اور تھکان بھی محسوس نہ ہوگی۔"

"شکریہ۔" یہ کہہ کر تیلما نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور جمیل نے گھنٹی بجا کر چوکیدار کو چائے لانے کے لیے بھیج دیا۔

جب وہ دونوں چائے پینے بیٹھے تو جمیل نے کہا۔ "مِس تیلما آپ ہر وقت تھکی تھکی سی رہتی ہیں۔ آپ کی آنکھوں میں ہمیشہ غم جھلکتا رہتا ہے اور آپ بے حد خاموش رہتی ہیں —— مجھے اس قسم کا ذاتی سوال ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ پر مَیں کیا کروں، یہ سوال مجھے کام نہیں کرنے دیتا، مجھے چین نہیں لینے دیتا اور مَیں سو نہیں سکتا۔"

تیلما کی کنجی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور ضبط کرنے کے باوجود ٹپ سے ایک قطرہ ٹرے میں گر پڑا۔ پھر اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور سسکیاں لینے لگی۔ جمیل کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ اس کے پاس جاتے ہوئے کہنے لگا۔

"اب تو خواہ کچھ بھی ہو جائے مَیں یہ بات معلوم کیے بغیر نہیں رہوں گا۔ میں پہلے ہی کافی پریشان تھا لیکن اب تمہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔" وہ اس کے بالکل قریب جا کھڑا ہوا اور اس کے کندھے کو آہستہ سے چھو کر کہنے لگا۔ "اگر تم نے مجھے یہ راز نہ بتایا تو میں تم سے کبھی بھی نہ بولوں گا۔" یہ بات کہتے ہوئے جمیل بے حد جذباتی ہو گیا اور اس کا جی تیلما کو کلیجے سے لگا لینے کو چاہنے لگا۔ تیلما نے گہر بار آنکھوں اور نمناک گالوں والا چہرہ اوپر اٹھایا اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں کسی بے وفا مرد کی کہانی ایک اور مرد کو کیوں سناؤں؟ جب اس نے میرا ہوتے ہوئے بھی مجھ

سے وفا نہ کی تو ایک غیر مجھ سے کیونکر ہمدردی کرے گا؟"

جمیل اس کی کرسی کے بازو پر بیٹھ گیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا۔ "شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ شاید میں ایسا ہی ہوں اور واقعی میں ایسا ہی ہوں کیونکہ لوگ مجھے ایسا ہی خیال کرتے ہیں، لیکن میرا دل کہتا ہے کہ میں وہ نہیں ہوں۔ میرا جی کرتا ہے کہ اگر میں ایسا ہوں بھی تو ویسا نہ رہوں۔"

تیلما نے اپنے اسی چھوٹے سے رومال سے آنکھیں پونچھیں اور اپنی اور گل کی داستانِ محبت سنانے لگی کہ کس طرح ان دونوں نے ایک دوسرے سے شادی کے وعدے کیے۔ کیسے وہ ایک رات چھپ چھپا کر گرجے میں پہنچے اور ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر محراب کے سامنے قسمیں کھائیں۔ اپنا گھر سجانے کے لیے کن کن چیزوں کی فہرستیں بنائیں۔ اپنے باغیچے کو سنوارنے کے لیے کیسے کیسے پھولوں اور پودوں کا انتخاب کیا اور جس شام تیلما اپنے مستقبل کے گھر میں آنے والے مہمانوں کی تواضع کے لیے ایک کُک بُک خرید کر لائی، گل نے ایک ایکسٹرا سے شادی کر لی اور وہ دونوں بمبئی چلے گئے۔

اور میری پیاری بچیو! اسی طرح دلاسے دیتے دیتے اور اس کے غم کو اپنا غم بناتے بناتے جمیل کو تیلما سے محبت ہو گئی۔ وہ اکٹھے سینما جاتے۔ ریستوران میں اکٹھے کھانا کھاتے اور سیر و تفریح کے لیے اکٹھے باہر نکلتے۔ رفتہ رفتہ تیلما کے غم کا سارا زہر جمیل نے چوس لیا اور وہ بالکل تندرست ہو گئی اور جب وہ تندرست ہو گئی تو اپنی جیبیوں میں گپیں اڑانے لگی اور زور زور سے ہنسنے لگی اور اے میری سعدیٰ کی سہیلیو! جب وہ ہنسنے لگی تو اسے ایک ساتھی کی ضرورت محسوس ہوئی جو اس کی ہنسی میں شرکت کرے اور اس کی ہنسی جس پہلے آدمی سے ٹکرائی تھی، وہ سوائے جمیل کے اور کوئی نہ تھا۔ اس نے اپنی کک بک ٹرنک سے نکالی اور آنے والے مہمانوں کی مدارات کے لیے اچھے اچھے کھانوں پر نشان لگانے لگی۔

جس دن تیلما جمیل کو اس کے کمرے میں ایک بند لفافہ دے کر جاتی ہوئی باہر بھاگ گئی تو جمیل کا دل چاہا کہ کاش اس نے زبیدہ سے وعدہ نہ کیا ہوتا۔ کاش اس کی زندگی میں نجمہ وارد نہ ہوتی تو تیلما سے شادی کی درخواست کرتا۔ اور جب لفافہ کھلا تو

تیلما کی طرف سے شادی کی درخواست تھی ——— زبیدہ سے اس نے وعدہ کر رکھا تھا۔ نجمہ اسے پیاری لگتی تھی اور تیلما بے سہارا تھی اور ان تینوں کے درمیان جمیل کیا تھا؟ اس کے متعلق نہ میں اس وقت سوچ سکا تھا ——— اور نہ ہی اب سوچ سکتا ہوں ——— کچھ اس طرح سے تھا ——— کہ ——— نہ وہ گھبرایا ہوا تھا، نہ پریشان تھا، نہ غمزدہ تھا اور نہ ہی راضی۔ وہ کچھ یوں تھا ——— لیکن میں بھی کیا کروں ——— مجھے کوئی مناسب لفظ ملتا ہی نہیں مگر اس کمرے کی فضا کو کیا ہوا؟ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے رُک رُک کر کیوں آ رہے ہیں؟ اس کی دیواریں سکڑتی جا رہی ہیں۔ تمہیں نیند آ رہی ہے اور تمہاری آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں۔ تم میں سے کئی اٹھ اٹھ کر چلی بھی گئی ہیں ——— اور جو باقی ہیں ——— جو باقی ہیں ——— لیکن یہ آواز کیسی؟ یہ پکار کس کی؟ شاید میری کوئی بچی یہیں سو گئی ہے ——— خیر! خیر ———

اور جمیل کسی کو بتائے بغیر جہلم کے ایک سکول میں ماسٹر لگ گیا ——— پکے محلے کے جس چھوٹے سے مکان میں وہ زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ریٹائرڈ سب پوسٹ ماسٹر رہتے تھے۔ یہ صبح صبح اٹھ کر شریف کے پٹرول پمپ پر شطرنج کھیلنے چلے جاتے اور شام ہوئی گھر واپس آتے۔ جمیل ہمیشہ ان کے ہاتھ میں سبزی کا ایک تھیلا دیکھا کرتا۔ وہ شام کے وقت اگلے دن صبح کو پکانے والی چیزیں خرید لایا کرتے۔ جمیل گلی کے موڑ پر یا پٹرول پمپ کے پہلو سے گزرتے ہوئے انہیں بڑے ادب سے سلام کیا کرتا۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے اس کا جواب دیتے۔ صحت کے بارے میں پوچھتے۔ سکول کی دلچسپیوں کا تذکرہ لے بیٹھتے اور تازہ خبریں پوچھا کرتے۔ ان کی شکل مولانا شوکت علی سے بہت کچھ ملتی تھی۔ وہی چہرہ ویسے ہی موٹے موٹے نقش، دھات کے فریم کی عینک، سر پر قراقلی ٹوپی، سفید فرنچ کٹ داڑھی، وضع سے ذہانت کے آثار نمایاں تھے مگر ان کی صحت ایسی اچھی نہ تھی۔ اکثر کسی نہ کسی عارضے کی لپیٹ میں آئے رہتے۔ پوسٹ ماسٹر صاحب بڑے خلیق آدمی تھے اور ان کی بیوی بھی اچھے کھلے دل کی عورت معلوم ہوتی تھیں۔ ان کے دو بچے تھے۔ ارشد اور بلقیس۔ ارشد یہ ہی کوئی بارہ برس کا ہو گا اور بلقیس کوئی پچیس کے لگ بھگ۔ جمیل نے بلقیس کو دیکھا تو نہ تھا مگر اس کی موجودگی کو بڑی شدت سے محسوس کیا کرتا تھا۔ وہ ہر شام کوٹھے پر آ کر بڑے دردناک لہجے میں میر کی ایک غزل پڑھا کرتی اور جب وہ یہ شعر پڑھتی ؎

ہر سُو سرِ تسلیم رکھے صید حرم میں
وہ صید فگن تیغ بکف کب ادھر آوے

تو یوں محسوس ہوتا جیسے کراہ رہی ہو اور آخری شعر پر پہنچ کر تو وہ واقعی رونے لگتی۔ ارشد جمیل کے سکول کا طالب علم تو نہیں تھا لیکن وہ سوال سمجھنے کے لیے ہر روز اس کے پاس آنے لگا۔ ایک دن باتوں باتوں میں جمیل نے ارشد سے بلقیس کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔ اس نے بتایا کہ پانچ سال ہوئے بلقیس آپا کی شادی اس کے چچیرے بھائی حسن میر سے ہوئی تھی جو اپنی شادی کے تیسرے مہینے تپ محرکہ سے چل بسے تھے۔ ابا جی نے کئی مرتبہ آپا کی دوسری شادی کے لیے کہا مگر وہ ہر بار ایسی بات سن کر رونے لگ جاتیں اور کئی کئی دن کھانا نہ کھاتیں۔ اس پر ابا نے اس سلسلے میں گفتگو ہی بند کر دی۔ جمیل کو آپا سے ہمدردی ہو گئی اور اب وہ میر کی غزل کو ایک دکھے دل سے سُننے لگا اور اس کے دل میں آپا کی بدنصیبیوں کا ایک جالا سا تنا جانے لگا۔ شب برات کو پوسٹ ماسٹر صاحب کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہ آ سکے۔ ناچار انہوں نے کھانا شروع کر دیا۔ اور جب جمیل ہاتھ دھونے کے لیے اٹھا تو آپا نے دروازے کے قریب آ کر کہا۔ "آپ کے پاس اتنے رسالے آتے ہیں مگر آپ نے ایک بھی نہ بھیجا۔" جمیل کوئی جواب نہ دے سکا اور کتنی دیر تک ایسے ہی ساکت و جامد کھڑا رہا۔ پھر اچانک اس نے چونک کر کہا۔ "آپ نے کبھی منگوایا ہی نہیں۔ میں بھیجتا بھی تو کیسے؟"

آپا نے کہا۔ "میں نے کئی بار ارشد کو کہا مگر اس نے شاید آپ سے ذکر نہیں کیا۔"

"تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔" جمیل نے دروازے کی طرف نگاہیں اٹھا کر جواب دیا۔ "اور پھر آپ کو میر پسند ہے اور میرے پاس میر کا کوئی دیوان نہیں۔"

آپا پہلے تو کتنی دیر خاموش کھڑی رہی پھر وہاں سے چلی گئی۔

اور پھر میری پیاری بچیو! ایک دن کوٹھے پر بلقیس نے جمیل سے کہا۔ "تم مرد بڑے بے وفا ہوتے ہو۔ جس نے ساری عمر مجھ سے نبھا دینے کا وعدہ کیا تھا، وہ مجھے چھوڑ کر روپوش ہو گیا۔ تم نے زبیدہ سے شادی کرنے کا اقرار کیا اور اس وعدے کو پورا نہ کیا۔ تم نے میرے غموں کو جاننے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا اور میرا سہارا شاید اس لیے نہ بن سکے کہ میں بیوہ ہوں۔ وہ چنگاری جو برسوں کی راکھ تلے دبی پڑی تھی، تم نے پھونکیں

مار مار کر پھر روشن کر دی اور اب اس چنگاری پر تم اپنے آنسو گرا کر اسے ہمیشہ کے لیے بجھا دینا چاہتے ہو—— لیکن تم یہاں آئے ہی کیوں؟ تم نے اس شہر میں قدم ہی کیوں رکھا؟ کیا وہ سرزمین جہاں تمہارے جیسے لاکھوں ہی مرد پھرتے ہیں، ایک اور جھوٹے اور فریبی کا بوجھ نہ سہار سکتی تھی؟ کیا تم وہاں سے اس لیے بھاگ آئے کہ غریب زبیدہ پوروں میں مہندی رچا کر اور مانگ میں صندل بھر کر وہاں آ گئی تھی؟"

اور جمیل کا بت اس کوٹھے پر کھڑا تھا اور اس خول کے اندر ایک سنگر مشین کے شٹل کی طرح گھوم رہا تھا۔ زبیدہ نجمہ—— نجمہ تیلما—— تیلما بلقیس—— بلقیس زبیدہ—— اور اس کے پتھر کے بت کے اندر کئی لہو بھرے دل منجمد ہو کر سنگین ہوئے جا رہے تھے۔ دھیمے جذبات کی کتنی ساری لہریں ٹھٹھر ٹھٹھر کر فولاد کی سلاخیں بنتی جا رہی تھیں۔ چار نسوانی ہاتھ مشین کی ہتھی بڑے زور سے گھما رہے تھے اور اندر شٹل بڑی تیزی سے گھوم رہا تھا لیکن یہ سنگینی اور یہ فولادی سختی زیادہ دیر تک قائم نہ رہی اور جمیل جمیل ہی رہا۔ بے وفا—— !سنگدل! جھوٹا اور فریبی!

اور میری پیاری بچیو! یہ قصہ بہت پرانا ہے۔ اس بات کو کئی برس بیت چکے ہیں اور جمیل معلوم نہیں کہاں ہے۔ کسی کو بھی اس کا علم نہیں لیکن پتہ نہیں میں اس کی جدائی کیوں محسوس نہیں کرتا تھا؟ مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ ہر دم میرے ساتھ ہو، میرے پاس ہو—— اور میرا ہاتھ بٹا رہا ہو۔ مگر ان آخری ایام میں میں نے بھی اسے کھو دیا۔ اب مجھے اس کی آواز آ رہی ہے۔ وہ کسی بوتل میں چیوں چیوں کر رہا ہے۔ مجھے بلا رہا ہے لیکن مجھے پتہ نہیں لگتا کہ یہ آواز کدھر سے آ رہی ہے اور وہ کہاں ہے—— مگر اے میری پیاری بچیو! اس کمرے کو کیا ہو گیا؟ آتشدان کی آگ کو کیا ہوا؟ اور یہ کھڑکی کس نے بند کر دی؟ تم کہاں ہو؟ میری بچیو؟ کدھر ہو؟ کیا تم مجھے چھوڑ کر چلی گئیں یا تمہیں نیند آ گئی ہے؟ یا تم یہاں آئی ہی نہیں اور میں یونہی بولتا چلا گیا۔ دیکھو میرا کمبل پھسل کر پاؤں میں گر گیا ہے اور اس کمرے کی دیواریں میری طرف بڑھتی چلی آ رہی ہیں اور میں اس فشار میں مجھے چیوں چیوں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا ہے اور فضا گھٹتی جا رہی ہے۔ تم کہاں ہو میری بچیو! کہاں ہو تم؟ بچیو! میری بچیو—— یہ چیوں چیوں کون کر رہا ہے—— بچیو—— بچیو—— میری بچیو!

توشے بلّے

وسط جنوری میں جب فرخ نے قتل کا پہلا مقدمہ جیتا تو اس کی شادی ہو گئی اور نیا جوڑا ہنی مون منانے کے لیے مری روانہ ہو گیا۔

پرانی وضع کی ٹیکسی راستے میں دو مرتبہ خراب ہوئی اور کئی بار پانی لینے کے لیے رکی۔ ڈرائیور ہر چشمے پر اس کا ریڈی ایٹر ٹھنڈے پانی سے بھرتا لیکن چند میل کی چڑھائی کے بعد انجن خراب ہو جاتا اور بھاپ کے بادل خنک فضا میں دودھیا پھٹکلوں کی طرح تیرنے لگتے۔ مری سے چھ میل ادھر سڑک کے کناروں پر کہیں کہیں برف پڑی تھی جس پر پہیوں سے اٹھنے والی گرد کے غلاف چڑھے تھے۔ جیسے جیسے ٹیکسی اوپر چڑھتی سڑک کے دونوں جانب مٹیالی ڈھیریاں ایک دوسرے کے قریب ہوتی جاتیں—— مرمریں دلہن کو پھریریاں لیتے دیکھ کر فرخ نے کمبل کی تہہ کھولی اور اس نے اپنی بیوی کی ٹانگوں پر پھیلا دیا۔ پورے چودہ سال بعد آج لڑکی کو اپنے گاؤں کا قبرستان نظر آ رہا تھا جس کے کنارے بے شمار چھوٹی چھوٹی بیریوں کے درخت تھے اور ان درختوں کے قریب قطار اندر قطار بہت سے شیرخوار بچوں کی قبریں تھیں۔ شام کے وقت گڈریے جب اپنے ریوڑ واپس گاؤں لاتے تو یہ ننھی ڈھیریاں گرد سے اٹ جاتیں اور ان پر ابھرے ہوئے روڑے گرد کی چادروں تلے دب جاتے لیکن صرف یہ ہی بات نہیں تھی۔ وہ لڑکی ٹھنڈ کی وجہ سے بھی کانپ رہی تھی!

جب ٹیکسی ایجنسی میں پہنچی اور ڈرائیور نے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا تو باہر کی روشنی اندر نہ آ سکی۔ موٹر کے اندر اور باہر ایک سا سماں تھا۔ آسمان پر اودے اودے بادلوں کے درمیان یہاں وہاں قرمزی قناتوں کے انبار لگے ہوئے تھے جن میں کچھ نئی

تھیں، کچھ پرانی اور چند ایک بالکل دریدہ و بوسیدہ!

مال روڈ کی چڑھائی چڑھتے ہوئے فرخ نے آہستہ سے پوچھا۔ "تھک تو نہیں گئی ہو؟"

اور دلہن نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "نہیں جی۔"

"جمیل صاحب کا ہٹ ذرا دُور ہے۔" فرخ نے سمجھدار خاوند کی طرح کھلتے ہوئے کہا۔ "کوئی بیس ایک منٹ کی چڑھائی اور ہو گی۔"

اور پھر دونوں خاموش ہو گئے۔

ہٹ بہت بڑا نہیں تھا۔ صرف تین کمرے تھے۔ ایک چھوٹا غسل خانہ اور ایک مختصر سا باورچی خانہ! سب سے بڑا کمرہ خواب گاہ تھی۔ اس میں دو پلنگ بچھے تھے اور کونے میں سیاہ رنگ کی ایک گول مول میز پڑی تھی۔ خواب گاہ کے پہلو میں ایک مستطیل کمرہ تھا جہاں دیوار کے ساتھ چارپائیاں کھڑی تھیں۔ ان کے پاس ایک بڑے آئینہ والی سنگار میز رکھی تھی جس کے ساتھ شیشم کی ایک وارڈروب ایستادہ تھی اور فرش پر تین کرسیاں بے ترتیبی سے ادھر اُدھر پڑی تھیں جن پر میلے کپڑے جھاڑنوں کی طرح پڑے تھے۔ اس کمرے میں دروازے کے علاوہ ایک دریچہ بھی تھا جس کے پٹ باہر ڈھلان کی طرف کھلتے تھے۔

فرخ نے یہاں آتے ہی سارے کمروں کی بتیاں جلا دیں اور اپنی بیوی کو ساتھ لے کر ہر کمرے کا معائنہ کرواتا پھرا۔ جب وہ بستر کھول رہے تھے تو فرخ نے کہا۔ "میرا جی چاہتا ہے کہ ہم بھی ایک ایسا ہی ہٹ بنوائیں۔ کوئی بھی موسم ہو، چند دن اپنی مرضی کے مطابق سکون سے بسر کیا کریں گے۔"

اس کی بیوی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور اس نے مسکراتے ہوئے اپنے گھر کے شیشوں میں سے اندر جھانک کر دیکھا جہاں گول مٹول لڈو سے دو بچے کھیل رہے تھے۔ پھر اس نے اپنی نگاہیں وہاں سے ہٹالیں اور بستر کھولنے میں مصروف ہو گئی۔

جب بستر بچھ چکے تو فرخ نے جگ اُٹھا کر کہا۔ "میں نیچے جا کر چائے کے لیے دودھ لاتا ہوں۔ پھر بہت اندھیرا ہو جائے گا اور بہت ممکن ہے۔ آج برفباری بھی شروع ہو جائے۔"

اس کی بیوی نے نگاہیں اٹھا کر کچھ کہنا چاہا مگر وہ بول نہ سکی۔ فرخ نے اوور کوٹ کے کالر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "ڈر تو نہیں لگے گا؟" اس کی بیوی نے ڈرتے ہوئے کہا۔ "نہیں جی۔"

جب وہ دروازہ کھول کر پتھریلی پگڈنڈی پر باہر نکلا تو اندھیرا چاروں طرف چھا چکا تھا اور پہاڑوں کی یخ بستہ چوٹیوں کے گرد برفیلی ہوا چنگھاڑ رہی تھی۔ اس کے جاتے ہی دلہن نے اندر سے چٹخنی چڑھا لی اور ہیٹر لگا کر کھانا گرم کرنے کی تیاری کرنے لگی۔ کھانے کی گول میز پر گرد جمی ہوئی تھی اور اس پر کیڑوں کے چلنے پھرنے سے آڑی ترچھی لکیریں اور نامکمل دائرے سے بن گئے تھے۔ جھاڑن لینے کے لیے وہ ساتھ کے کمرے میں گئی تو وارڈروب کی قریبی کرسیوں سے سویٹر بُنتی ہوئی لڑکی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ فرخ کی بیوی ہڑبڑا کر بھاگنے لگی تو اس لڑکی نے مسکرا کہا۔

"گھبرائیے نہیں۔ مَیں آپ کی پڑوسن ہوں، ابھی ابھی مَیں یہاں سے گزری تو اس کمرے میں روشنی دیکھ کر میں نے اندر جھانکا۔ یقین مانیے میں بد تمیز نہیں ہوں لیکن تجسّس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے نہ صرف شیشوں میں سے اندر نگاہ دوڑائی بلکہ دریچہ کھول کر اندر بھی آ گئی۔"

فرخ کی بیوی خوف سے کپکپا رہی تھی اور پہاڑ کی چوٹی پر برفیلی رات کے سناٹے نے اس کپکپاہٹ کو لرزے میں تبدیل کر دیا۔

اس لڑکی نے ویسے ہی مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کو بہت سردی لگ رہی ہے۔ تھوڑی دیر بیٹھ جائیے، پھر اتنی سردی نہیں لگے گی۔"

فرخ کی بیوی خواب میں چلنے والے انسان کی طرح قدم اٹھانے لگی اور سنگار میز کی طرف ہولے ہولے یوں بڑھی جیسے اژدھے کے کھولے ہوئے منہ کی طرف آہو بچہ لپکتا ہے۔ جب وہ میز کے کونے پر بیٹھ گئی تو اس لڑکی نے کہا۔ "مَیں نے آپ کو اور آپ کے شوہر کو موٹر سے اترتے دیکھا تھا اور مال روڈ پر آپ کے شوہر کا یہ جملہ بھی سنا تھا کہ تم تھک تو نہیں گئی ہو؟ مجھے عام عورتوں کی طرح مرد بُرے نہیں لگتے۔ اس لیے آپ کا خاوند بھی بُرا نہیں لگا اور جب اس نے یہ فقرہ کہا تو میرے دل میں اس کی عزت دوچند ہو گئی ــــ ایک ایسے ہی آدمی کے لیے میں زندگی بھر انتظار کرتی اور جی ہی

جی میں اسے آوازیں دیتی رہی۔ میری پکار کے جواب میں اس کی آواز بڑی دور سے آیا کرتی جیسے مچھلیاں پکڑنے کے لیے کسی اندھیری رات کو سمندر میں بہت آگے چلا گیا ہو۔ میں ساحل پر کھڑی اسے آوازوں پر آوازیں دیئے جاتی۔ وہ ہر آواز کا جواب بڑی محبت سے دیتا مگر واپس نہ آتا۔ میرے رشتہ کے بہت سے پیام آئے مگر میں تو صرف اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر کسی اور کے لیے پوروں میں مہندی کیوں رچاتی!! ابّی میرے اس رویئے سے بہت نالاں تھے مگر میں چونکہ ان کی مرحوم اور چہیتی بیوی کی ایک ہی نشانی تھی، اس لیے وہ بظاہر مجھ سے ناراض نہ رہتے۔ اوّل اوّل میں ضدی تھی، پھر خودسر ہو گئی اور بعد میں میرے ارادے ناقابلِ تسخیر ہو گئے۔" پھر اس نے سویٹر بُننا چھوڑ کر نگاہیں اوپر اٹھائیں اور کہا۔ "آپ آرام سے بیٹھ جائیں، اس طرح آپ کے پاؤں سو جائیں گے۔ اب تو آپ کو سردی نہیں لگ رہی؟"

فرخ کی بیوی نے ہولے سے نفی میں سر ہلایا اور وہ لڑکی کہنے لگی۔ "میں اپنے خاندان کے نوجوانوں سے محبت کرنے کی اس لیے قائل نہ تھی کہ ساتھ رہتے رہتے یونہی سا ایک لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے جس کا محبت کے تصور سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ میں تو چاہتی تھی کہ ملک کیچم سے اچانک ایک شہزادہ آئے۔ میں پہلی ہی نظر میں اسے پہچان لوں اور پھر تھلوں میں اس کی ڈاچی کے نقوشِ پا پر بھاگ بھاگ کر بگولا بن جاؤں یا سپین کے کسی اکھاڑے میں وہ بل فائٹنگ کے لیے نکلے۔ تماشائیوں میں اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑے اور وہ خونخوار چوپائے سے غافل ہو جائے جو اسے سینگوں پر اٹھا کر ہوا میں اُچھال دے، پھر جو ہو سو ہو۔ وہ زندہ رہے یا دم توڑ دے مجھے میرا گوہرِ مقصود مل جائے اور میں نے اپنی جاہل سہیلیوں سے کہا تم ہنستی ہو لیکن ایک دن وہ آئے گا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ہوں گے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی ہوں گی۔ وہ ہمارے خیمہ کے پاس آ کر کہے گا۔ 'میں بھی پیاسا ہوں اور میری ناقہ بھی پیاسی ہے۔ حدی خوانی میں میرا گلا سوکھ گیا ہے اور ناقابلِ برداشت بوجھ سے میری اونٹنی کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ مجھے پانی پلاؤ، مجھے کھانے کے لیے کچھ دو۔" پھر اچانک اس کی نگاہیں میرے ہاتھوں پر پڑیں جن پر شہد کے پیالے نانِ شعیر سے ڈھانپے پہلے سے اس کی منتظر ہوا کروں۔ میرے کندھے پر چشمے کے ٹھنڈے پانی کا مشکیزہ لٹک رہا ہو' اور میری آنکھوں

میں نخلستانوں کا تلطف ہو لیکن میری یہ بات سن کر میری جاہل سہیلیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور دیر تک ہنستی رہیں مگر ان کی ہنسی زیادہ دیر تک ان کا ساتھ نہ دے سکی اور ایک دن وہ آ ہی گیا۔ اس نے برآمدے میں آ کر گھنٹی بجائی اور میں نے دروازہ کھول کر اسے دیکھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا جھینپا، گھبرایا اور پھر ابّی کے بارے میں پوچھنے لگا۔ میں نے کہا وہ ابھی تک کچہری سے نہیں لوٹے۔ آپ پیام دے جایئے۔ شام کو آئیں گے تو میں ان سے کہہ دوں گی۔ اس نے ویسے ہی گھبراتے ہوئے کہا۔ "وہ مجھے نہیں جانتے اور پھر میرا کام بھی ایسا ہی ہے کہ کسی تیسرے آدمی کو بتایا نہیں جا سکتا۔"

اس تیسرے آدمی پر مجھے ہنسی آ گئی اور میں نے کہا۔ "ابّی اور میں، میں اور ابّی ایک ہی بات ہے۔" اور جیسا کہ مجھ پر اعتماد ہونا چاہیے تھا اسے اس بات پر یقین آ گیا اور اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "میرے ایک دوست نے اس مرتبہ ایل-ایل-بی کا امتحان دیا ہے اور اس کا پرچہ آپ کے ابّی کے پاس ہے۔ مجھے صرف اس کے نمبر معلوم کرنا ہیں۔" میں نے جسارت سے کام لے کر کہا۔ "آپ جھوٹ کیوں بولتے ہیں اور اپنے پرچے کو اپنے دوست کا پرچہ کیوں بتاتے ہیں؟" یہ کہتے ہوئے میں مسکرا دی اور اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ میں نے بڑے مربیانہ انداز میں کہا۔ "کل آپ اپنی بہن کو لے کر یہاں آ جایئے اور اسے مجھ سے متعارف کرا دیجئے۔ میں ابّی سے کہوں گی کہ یہ میری سہیلی ہے اور ان کے بھائی کا پرچہ آپ کے پاس ہے، انہیں نمبر بتا دیجئے۔" خوشی کی ایک لہر دم بھر کو اس کے چہرے پر ابھری اور اس نے کہا۔ "میری چھوٹی بہن ہے وہ اگر——" میں نے بات کاٹ کر پوچھا۔ "کتنی چھوٹی؟" تو اس نے بڑی نیاز مندی سے کہا۔ "فرسٹ ایئر میں پڑھتی ہے۔" یہ بات سُن کر میں بھی اپنی جاہل سہیلیوں کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

فرخ کی بیوی کا خوف آہستہ آہستہ دُور ہوتا جا رہا تھا اور اب اس پر صرف سردی کی کپکپاہٹ طاری تھی۔ اس لڑکی نے سویٹر کے گھر گن کر کہا۔ "آپ کو سردی لگتی ہو تو میری شال اوڑھ لیجئے۔" اور دلہن نے ہولے سے کھنکار کر کہا۔ "نہیں!"

لڑکی پھر سویٹر بُننے لگی اور کہنے لگی۔ یہ باتیں تو بالکل بے مصرف ہیں کہ نمبر معلوم کرنے کے بعد کس طرح وہ اور اس کی بہن ہمارے یہاں آتے جاتے رہے اور

یگانگت بڑھتی گئی۔ وہ بڑا ہی کمزور طبیعت اور شریف انسان تھا۔ ہر وقت کسی گہری سوچ میں کھویا رہتا لیکن سوچ کی اونچی نیچی گھاٹیوں میں ارادے کی ایک بھی کونپل نہ پھوٹتی۔ جب ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ اس کی نسبت اس کے چچا کے یہاں ہو چکی ہے تو مَیں نے پوچھا کہ "تمہیں میری پکار سنائی نہیں دی تھی۔ مَیں تمہیں آواز دیتی رہی، سال ہا سال تک تمہارا انتظار کرتی رہی اور تم آئے بھی تو اپنا دامن کسی اور کے ہاتھوں میں تھما کر!" یہ سن کر اس کے آنسو بھر آئے اور وہ جواب نہ دے سکا۔

مَیں نے اپنی اوڑھنی سے اس کی آنکھیں خشک کیں۔ اس کے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر صوفے کی پشت سے لگا دیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ چند مہینوں کے بعد اس کے چچا اور ابا کے درمیان کوئی جھگڑا ہو گیا اور اس کی منگنی ٹوٹ گئی —— اس کی بہن اس منگنی کے ٹوٹ جانے سے بہت خوش ہوئی اور بچّوں کی طرح بار بار مجھ سے کہنے لگی کہ اس کے بھائی کے لیے اب میں کوئی لڑکی تلاش کروں جس کی شکل مجھ ایسی ہو، قد میرے جتنا ہو اور رنگ بھی میرے جیسا ہی ہو۔ وہ چند دن ہم تینوں نے بڑی مسرت اور شادمانی کے ساتھ بسر کیے۔ میرے دامن میں اتنی خوشیاں جمع ہو گئیں کہ مجھے ہر لمحہ اپنی جھولی کے پھٹ جانے کا خدشہ ہونے لگا۔ شادی کے متعلق مَیں نے ابّی کو اپنے ارادوں سے آگاہ کر دیا اور وہ میری ضد پوری کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنے لگے۔

ایک دن کیرم کھیلتے ہوئے مَیں نے اس سے کہا۔ "توصیف کتنا پیارا نام ہے۔ چھوٹے بچّے کا اس سے پیارا نام اور کیا ہو سکتا ہے بھلا؟" وہ سوچنے لگا تو مَیں نے کہا۔ "یوں لگتا ہے نا جیسے توصی کر کے سٹرائیکر کیرم بورڈ پر پھسلا ہو اور آہستہ سے گوٹ سے جا ٹکرایا ہو۔" وہ مسکرانے لگا تو مَیں نے کہا۔ "مَیں تو اپنے بچّے کا یہی نام رکھوں گی۔ توصیف —— توصی —— توشی —— توشے ہے نا؟ —— توشے بلّے —— توشے بلّے جھا!" اور پھر لڈو سا ایک بچہ کیرم کی گوٹیں نکال کر بھاگ گیا۔ لڑکی نے چھوٹے سے سویٹر کو انگلیوں سے ناپ کر دیکھا اور کہا۔ "معاف کیجئے گا۔ پتہ نہیں مَیں کیوں بغیر اجازت اندر چلی آئی اور آپ سے پوچھے بنا یہ داستان بھی بیان کرنے لگی۔ شاید آپ کو میری یہ باتیں بہت ہی ناگوار گزر رہی ہوں۔"

فرخ کی بیوی نے پھر نفی میں سر ہلایا اور وہ لڑکی کہنے لگی۔ "اس دن کے بعد

سے مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ میں زندگی بھر توشے بلّے کو آوازیں دیتی رہی ہوں۔ اسی کو پکارتی رہی ہوں اور میرے ہاتھوں میں شہد کے پیالے یا میرے کندھے پر مشکیزہ کبھی بھی نہیں ہوا بلکہ مَیں اپنے گھر کے دروازے پر اس کے ننھے ننھے بوٹ تھام کر اور کندھے پر اس کا چھوٹا سا سویٹر ڈال کر توشے بلّے کو بلاتی رہی ہوں جو سردی کے دنوں میں گلی کے بچوں سے کھیل رہا ہوتا تھا!"

پھر وہ ذرا رکی اور دیوار پر نگاہیں جما کر کہنے لگی۔ "میرا اب بھی یہی ایمان ہے کہ انسان کائنات کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ وہ ستاروں پر کمند ڈال سکتا ہے، پہاڑوں کے دل چیر دیتا ہے۔ آسمان و زمین کی ہر قوت کو مسخر کر لیتا ہے لیکن جذبۂ آفرینش کی رو کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں بہا سکتا اور فطرت کے تخلیقی منصوبوں میں دخل نہیں دے سکتا۔ توشے بلّے کی مجھے ضرورت تھی، مادرِ فطرت کو نہ تھی —— چچا کے یہاں نسبت ٹوٹنے کے بعد اس کے والد کو تجارت کا شوق چرایا اور انہوں نے اپنے بیٹے کی بات اپنے شریکِ کار کے یہاں ٹھہرا دی۔ مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے سب سے منہ موڑ لیا حتیٰ کہ اپنے پیارے ابّی کو بھی عمر بھر کے لیے روتا دھوتا چھوڑ کر مادرِ فطرت کو سمجھانے لگی۔ جانتی ہوں قدرت مجھ سے قوی تر ہے لیکن میں بھی بڑی ضدی ہوں اور خود سر ہوں ——

اور آج آپ لوگوں کی طرح مَیں بھی یہاں ہنی مون منانے آئی ہوں۔

توشے بلّے میرا بچّہ ہے —— میرا بچّہ ہے —— میرا بچّہ! ——" اس نے سلائیوں میں دیا ہوا سویٹر اپنے سینے سے لگا لیا اور سسکیاں بھرنے لگی۔

دروازے پر دستک ہوئی اور فرخ کی بیوی دیوانوں کی طرح ڈرائنگ روم کی طرف بھاگی۔ دروازہ کھول کر وہ فرخ سے لپٹ گئی اور چیخ کر کہنے لگی۔ "وہ کہتی ہے توشے بلّے میرا بچہ ہے —— میرا بچّہ ہے۔"

یہ نام سُن کر فرخ ٹھٹکا اور دودھ کا جگ زمین پر رکھ کر اندر اس کمرے میں گیا۔ بتی جل رہی تھی، کرسیوں پر میلے کپڑے جھاڑنوں کی طرح پڑے تھے اور سنگار میز کے آئینے میں اس کا اپنا عکس اسے گھور رہا تھا۔

☆--------------☆

صفدر ٹھیلا

صفدر ٹھیلا مر گیا اور مجھے مرنا ہے لیکن کوئی چاہے مجھے تو تھے تیروں سے اڑا
دے۔ سچّی بات میں کہوں پر کہوں اور مجھے ڈر بھی کس بات کا۔ بہت سے دوست مر
کھپ گئے۔ کئی ایک سرحد کے اس پار رہ گئے اور جو باقی بچے، ان کا پتہ نہیں۔ کوئی پورب
میں ہو گا، کوئی پچھم میں۔ نہ کسی کو میں نے یاد کیا اور نہ کسی نے مجھے یاد کرنے کی زحمت کی
ہو گی۔ ایک زمانہ تھا جب ہم سکول میں اکٹھے پڑھا کرتے تھے۔ ٹولیاں بنا کر بیر اور
ہولیں کھانے جایا کرتے تھے اور مل جل کر ریل کے آؤٹر سگنل میں اینٹیں پھنسا کر رکتی
ہوئی گاڑی کی سیٹیاں سنا کرتے تھے۔ مسافروں کو کھڑکیوں سے سر نکال کر جھلّاتے اور
جھنجھلاتے دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور تالیاں بجاتے تھے لیکن اب تو زمانہ ہی بدل گیا۔
اب گاڑی سگنل سے باہر رکتی ہے تو بڑی کوفت ہوتی ہے۔ ایسی الجھن ہونے لگتی ہے کہ
ڈبے سے اتر کر پیدل چلنے کو جی چاہتا ہے۔ اس میں اگر کوئی راہگیر رکتی ہوئی گاڑی کو دیکھ
کر مسکراتا ہے تو اس کا گلا گھونٹ دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس کی نوزائیدہ مسکراہٹ پر کیچڑ
مل دینے کی خواہش ہوتی ہے لیکن افسوس ہو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ گاڑی رکی رہتی
ہے۔ سیٹیاں بجا کرتی ہیں اور راہگیر مسکرائے جاتا ہے۔ جب ہم سرنگوں سگنل کی آہنی
سلاخ کو "زور لگاؤ بھیّا" کہہ کر اوپر اٹھاتے اور اس کے نیچے اینٹیں پھنساتے تھے تو سب
کچھ ہو جاتا تھا۔ اس وقت ہم ہیّا ہیّا کے سوا کچھ بھی نہ جانتے تھے اور اب افسوس اور
تاسف کے سوا کسی چیز کی بھی خبر نہیں! دن بھر میں جس قدر شرارتیں ہوتیں جتنے فتنے
برپا کیے جاتے، ان میں حبیب ٹینی کا بڑا ہاتھ ہوتا۔ میکانکی شرارتیں اس کی گھٹی میں پڑی
تھیں اور ہر روز کوئی نہ کوئی انوکھی شرارت سوچ کے آتا۔ ہمیں ترکیب بتاتا اور خود

بالکل علیحدہ ہو کر تماشائی کی حیثیت سے نظارہ کیا کرتا۔ تحقیق ہوتی، ہم پکڑے جاتے۔
ہیڈ ماسٹر صاحب کے ہاں پیشی ہوتی۔ بید جھپٹ جھپٹ کر ہماری ہتھیلیوں کو بوسے دیتا
اور ہم بغلوں میں ہاتھ دبا کر اپنی کلاسوں میں چلے جاتے اور حبیب ٹینی نئی شرارت کے
بارے میں سوچنے لگتا۔ چھچھی پر تم بالکل گدھا آدمی تھا۔ اللہ میاں نے تو اسے محض
بیلوں کی دم مروڑنے اور ہل چلانے کے لیے پیدا کیا تھا مگر والدین کی ستم ظریفی کہ
اسے مدرسے بھجوا کر ہماری جانوں کے لیے مستقل عذاب بنا دیا تھا۔ چھچھی ہر شرارت
میں حصہ لیتا اور ضرور پکڑا جاتا۔ معمولی سے معمولی ماسٹر کی ہلکی سی ہلکی گھرکی کے آگے
ہتھیار ڈال دیتا اور ہم سب کو پکڑوا دیتا۔ ہم نے منتیں کیں، ہاتھ جوڑے، پر چھچھی نے
ہمارا ساتھ نہ چھوڑا اور حسب توفیق ہماری مصیبتوں میں اضافہ کرتا ہی رہا۔ برکت
مہاشا، انور طوطا اور مدن بھی کئی مرتبہ اس سے دست و گریباں ہوئے۔ اس کی اچھی
خاصی مرمّت بھی کی لیکن اس نے پارٹی کی خدمت کو عین سعادت سمجھا اور ہمارے
ساتھ چپکا رہا۔

صفدر ٹھیلا ہمارا یار تھا لیکن اس نے ایسی شرارتوں میں کبھی حصہ نہ لیا۔ وہ ہر
معرکے پر ہمارے ساتھ ہوتا، پرے بیٹھ کر آرام سے مسواک کیے جاتا اور استرا
پھیرے سر پر ہاتھ پھیرتا رہتا۔ جب میں دسویں میں آیا تو وہ میٹرک کا امتحان تیسری
مرتبہ دینے والا تھا۔ ریاضی میں صفر اور انگریزی میں دس پندرہ نمبر سے بھی آگے نہ
بڑھ سکا۔ اردو فارسی میں پاس ہو جاتا اور تاریخ کے پرچے میں ہمیشہ اوّل آتا رہا۔ سارا
سکول اس سے خوف کھاتا تھا۔ لڑکے باری باری سے تفریح کے گھنٹے میں اس کے گھر
سے کھانا لاتے، اس کے لیے مسواکیں بنا کر لاتے اور چھٹی کے وقت جب وہ سیدھا
اکھاڑے جاتا تو لڑکے ہی اس کا بستہ چھوڑنے گھر جاتے۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب
پنڈت امرناتھ صاحب بڑے کڑے آدمی تھے۔ سکول میں کسی قسم کی بے قاعدگی
برداشت نہ کرتے۔ کوئی لڑکا بھولے سے ممنوعہ گراس پلاٹ میں پاؤں رکھ دیتا تو ایک
درجن بید سے کم اس کی تواضع نہ ہوتی لیکن صفدر ٹھیلے سے وہ بھی دبتے تھے۔ اگر کبھی
اس کو سزا دینے کی ضرورت محسوس ہوتی تو مولوی ابوالحسن صاحب سے کہتے۔ مولوی
صاحب ٹھیلے کو کان سے پکڑ کر کشاں کشاں دفتر میں لے جاتے اور پنڈت جی کی میز کے

سامنے کھڑا کر کے اپنے مخصوص لہجے میں کہتے۔ "نالائق خبیث توبہ کر، معافی مانگ پنڈت جی سے۔ نہیں تو جان سے مار دوں گا۔" اور ٹھیلا ہنستے ہوئے کہتا۔ "توبہ جی پنڈت جی، معافی دے دو جی۔" اور پنڈت جی معاف کر دیتے۔

ایک مرتبہ سکول کا چپڑاسی ڈاک لے کر پوسٹ آفس جا رہا تھا صفدر ٹھیلے نے آواز دے کر کہا۔ "دیوان چند میرا خط بھی لیتے جانا۔" دیوان چند ایک لمحے کے لیے رکا، پھر پلٹ کر بولا۔ "سرکاری کام سے جا رہا ہوں، فرصت نہیں۔" صفدر نے دو زقندیں بھر کر جا دبوچا اور اس کی ناک پر اپنے ہتھوڑے ایسے سر کی ایسی ٹکر جمائی کہ خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ چپڑاسی نے ڈاک زمین پر پھینک دی اور بھیں بھیں رونے لگا۔ "ہائے تھانے جاؤں گا، پولیس بلاؤں گا—ہائے تھانے جاؤں گا۔" ٹھیلے نے اسے چاروں شانے چت زمین پر گرا دیا اور چھاتی پر سوار ہو بیٹھا۔ لہولہان چہرے پر زناٹے کا طمانچہ رسید کرتا اور کہتا۔ "لاٹ کے پاس جا کتے بچے میں تجھ سے ڈرتا ہوں۔" کتا بنیا نیچے پڑا ہوا ہاتھ جوڑ رہا تھا اور ٹھیلا چھوڑتا نہیں تھا۔ میں اور بگھی دوڑے دوڑے گئے تو اس نے غصے سے میرا ہاتھ جھٹک کر کہا۔ "مولوی دوڑ جا، تجھے بھی مار بیٹھوں گا۔" میں تو ایک طرف دبک گیا مگر بگھی اس سے لپٹ گیا اور کہنے لگا۔ "جا بڑا معتبر مار بیٹھے گا۔ اب تجھے نہ چھوڑوں گا۔" مدن بگھی چھ فٹ لمبا سرکنڈا تھا۔ پگڑی جوتوں سمیت کوئی سات سوا سات سیر وزن ہو گا لیکن تھا بڑی دھن کا آدمی۔ ٹھیلے نے پہلے تو اسے قہر بھری نظروں سے دیکھا، پھر ہنس پڑا اور اسے موٹی سی گالی دے کر کہا۔ "لے جا اس خنزیر کو میری آنکھوں سے دور۔ نہیں تو حلال کر دوں گا کتے کو۔" بگھی چپڑاسی کو اٹھا کر نل کی طرف لے چلا لیکن وہ اپنی کلائی چھڑوا کر دفتر کی طرف بھاگا اور شور مچانے لگا۔ پنڈت جی نے مولوی ابوالحسن صاحب کو بلا کر دیوان چند کی حالت دکھائی اور ٹھیلے کو فوراً سزا دینے کی تلقین کی۔ مولوی صاحب ململ کا کرتہ اور ٹخنوں سے اونچا پائجامہ پہنے پھنک کر باہر نکلے۔ ٹھیلے کو بلانے کے لیے مجھے بھیجا۔ صفدر اس وقت ٹک شاپ پر لسی پی رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر بولا۔ "آ یار مولوی غصہ تھوک دے، لسی پی۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "چل تیرے لیے بھی لسی تیار ہے۔ مولوی جی تیرا انتظار کر رہے ہیں۔ مولوی جی بلاتے ہیں۔"

اس نے گلاس وہیں چھوڑ دیا اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "زیادہ غصے

میں تو نہیں؟"

میں نے کہا۔ "زیادہ غصے میں! آج تو وہ تیری ہڈی پسلی توڑ ڈالیں گے۔" میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ ذرا جھکا اور رازدارانہ لہجے میں کہنے لگا۔ "بھلا مولوی جی کی پنشن کب ہو گی؟" میں نے کہا "جب تک تو پاس نہیں ہوتا، مولوی جی کی پنشن نہیں ہو سکتی۔ مولوی جی نہ ہوں تو تو سکول کو پانی بنا دے۔"

ٹھیلا ہنسا اور ماسٹر ایشر داس کو ادھر آتے دیکھ کر بولا۔ "میں تو ماسٹر ایشر داس سے بھی بہت ڈرتا ہوں۔" اور جب ماسٹر جی ہمارے محاذ میں آ گئے تو ٹھیلا نے کہا۔ "کیوں ماسٹر گڑ پنکھ میں تجھ سے بھی ڈرتا ہوں نا؟" ماسٹر جی نے تیوری چڑھائی اور منہ ہی منہ میں گالیاں دیتے ایک طرف نکل گئے۔

مولوی ابوالحسن صاحب کے ہاتھ میں شہتوت کی ایک لچکدار چھڑی تھی اور ڈرل گراؤنڈ میں کھڑے غصہ میں کانپ رہے تھے۔ میں ٹھیلا کو ساتھ لے کر آیا تو وہ چیل کی طرح جھپٹے اور پٹے کے ہاتھ چلانے شروع۔ ٹھیلا جھوٹ موٹ مر گیا جی۔ ہائے مر گیا جی کہہ رہا تھا اور مولوی جی اسے عربی فارسی کی متروک گالیاں دیئے جا رہے تھے۔ سب لڑکے کلاسیں چھوڑ کر باہر بھاگ آئے۔ ماسٹر صاحبان انہیں دروازوں سے ہٹا کر اندر کلاسوں میں لانے کے لیے باہر نکلے تو گراؤنڈ کے ڈرامے میں ایسے محو ہوئے کہ انہیں اپنا ہوش بھی نہ رہا۔ وہ لڑکے جنہیں صفدر ٹھیلا وقتاً فوقتاً پیٹتا رہتا تھا، اس سزا پر سب خوش ہوئے۔ ان سب نے مل کر مولوی ابوالحسن صاحب زندہ باد کا نعرہ بلند کر دیا۔ اس نعرے نے ماسٹروں کو چونکا دیا اور وہ اپنی کلاسوں کو گالیاں دیتے ہوئے کمروں کی طرف ہانکنے لگے۔ مولوی صاحب کمزور چرخ ہاتھوں سے صفدر پر قمچیاں برسا رہے تھے۔ ان کا دم پھول چکا تھا اور اب ان سے بات بھی نہ ہو سکتی تھی۔ انہوں نے چھڑی پرے پھینک کر کہا۔ "زمین پر ناک سے چھ لکیریں نکال۔ ابھی اسی وقت نہیں تو ہڈیاں توڑ دوں گا۔" صفدر ٹھیلے نے فقرہ ختم ہونے سے پہلے دونوں گھٹنے زمین پر ٹیک دیئے اور گراؤنڈ پر ہتھیلیاں جما کر لکیریں نکالنے لگا۔ لکیریں نکل چلیں تو مولوی جی اسے کان سے پکڑ کر حسب دستور دفتر میں لے گئے اور پنڈت جی کے سامنے ہاتھ جڑوانے لگے۔

انور طوطے اور برکت مہاشے کو مولوی صاحب ایک آنکھ نہ بھاتے تھے اور

وہ حبیب ٹینی سے مولوی صاحب کو سزا دینے کی ترکیبیں پوچھتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ جب ٹینی نے انور طوطے کو ایسی دوا لا کر دی جس کے لگاتے ہی داڑھی کے بال دو منٹ میں جھڑ جائیں تو صفدر ٹھیلے کو پتہ چل گیا۔ اس نے برکت مہاشے کی رانوں اور پنڈلیوں پر ہاکیاں مار مار کر سارا راز اگلوا لیا اور ٹینی اور طوطے کی وہ مرمت کی کہ ہم سب نے ٹھیلے سے بائیکاٹ کر دیا اور تین چار روز تک تو ہم اس سے کنی کاٹ کر گزرتے رہے۔ اس کے بعد ہم نے اس کے خلاف کھلم کھلا پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ ہمارے اس متحدہ محاذ میں ماسٹر گٹکا بھی شریک ہو گیا اور ہماری کارروائیوں کو ہوا دیتا رہا۔ پنڈت جی ہمارے ساتھ بھلے مانسوں کا سلوک کرنے لگے اور ہم سکول کے معتبر لڑکوں میں سے ہو گئے اور وہ لڑکے جو ہم سے بولنا بھی پسند نہ کرتے تھے، ہمارے دوست بن گئے۔ اب ہم ٹک شاپ میں ٹانگیں پسار کر لسّی پیتے، گراؤنڈ میں چوکڑی جما کر تاش کھیلتے اور لڑکوں کی ٹوپیاں اتار کر درختوں پر اچھال دیتے۔ کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ کسی کی مجال نہ تھی جو شکایت کرتا۔ کسی کی جرأت نہ تھی جو شکایت پر کان دھرتا۔ صفدر ٹھیلا بدستور سکول آتا رہا اور اپنے سب سے آخری ڈسک پر سر جھکائے جاسوسی ناولیں پڑھتا رہا۔ نہ کوئی ماسٹر اسے بلاتا، نہ کوئی لڑکا اس سے گفتگو کرتا اور نہ ہی وہ کسی سے بات کرنے کی کوشش کرتا۔

پھپھی پریتم ایک جاٹ اوپر سے عورتوں کی سی مت۔ جس ماسٹر سے ملتا بڑی بے تکلفی سے پیش آتا۔ اکثر کلاس میں ایسی بے ہودہ بات کرتا کہ سارے لڑکے کھلکھلا کر ہنس دیتے اور ماسٹر صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے۔ ایک دن دوپہر کے وقت وہ پگڑی بغل میں دبائے ممنوعہ گراس پلاٹ میں اتر کر پھول توڑ رہا تھا کہ پنڈت جی آ گئے۔ انہوں نے کڑک کے پکارا' تو اپنے جوڑے میں پھول ٹانکتے ہوئے بولا۔ "آیا بادشاہو۔" چند لڑکے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ وہ ٹھٹک کر تماشا دیکھنے لگے۔ پھر ماسٹر صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جاتے ہی اس کی خبر لینی شروع کر دی۔ پھپھی کا جوڑا کھل گیا۔ پگڑی پرے جا گری اور وہ بڑے اکھڑے لہجے میں "ٹھہر جاؤ بادشاہو، صبر کرو بادشاہو" کے نعرے لگاتا گیا۔ پنڈت جی چڑ گئے اور انہوں نے تابڑ توڑ بید برسانے شروع کر دیئے۔ ہم میں سے کسی کی جرأت نہ تھی کہ پھپھی کی مدد کرتا۔ ہر ایک اسی کو برا بھلا

کہہ کر اپنی جگہ پر دبک گیا۔ صفدر ٹھیلے نے جب یہ چیخ و پکار سنی تو بگولے کی طرح کلاس سے نکلا اور جا کر پنڈت جی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئے اور سرخ آنکھوں سے ٹھیلے کو گھورتے دفتر میں چلے گئے۔ صفدر نے زمین سے پھپھی کی پگڑی اٹھائی اور پلاٹ میں بکھرے ہوئے پھول چنے اور پریتم کی کمر میں ہاتھ ڈال کر باہر لے گیا۔

اس واقعہ کے بعد صفدر پھر ہمارا دوست بن گیا۔ ہم باری باری اس سے گلے ملے۔ ٹینی اور طوطے سے اس نے کان پکڑ کر معافی مانگی۔ برکت مہاشے کی کمر میں زور کا دھموکا مار کر بولا۔ "موٹے مہاشے، اب بھی ناراض ہو تم؟" مہاشہ ہنس پڑا تو ہم سب نے ٹک شاپ پر جا کر پیڑوں والی لسّی کے دو دو گلاس پیئے اور پیسے پھپھی کے نام لکھوا دیئے۔

صفدر ٹھیلا ٹل پر بیٹھا دانت صاف کر رہا ہوتا اور پنڈت جی ادھر آ نکلتے تو وہ کسی نہ کسی کو مخاطب کر کے کہتا۔ "اس کی موت میرے ہاتھوں آئے گی۔ پھانسی لگ جاؤں گا، پر اس کا خون کر کے رہوں گا۔ بھلا اس نے پھپھی کو کیا سمجھ کے مارا۔" ہر روز ایسی باتیں سن سن کر پنڈت جی محتاط ہوتے جا رہے تھے۔ انہوں نے بہانے بہانے ٹھیلے کے ایسے فقرے مولوی ابوالحسن صاحب کے گوش گزار بھی کیے۔ مولوی صاحب نے حسبِ عادت ٹھیلے کو طمانچے مار مار کر اس کے منصوبوں کے بارے میں کئی مرتبہ پوچھا لیکن وہ مکرتا ہی رہا اور قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتا رہا کہ اس کا کوئی ارادہ نہیں، کوئی منصوبہ نہیں——

ہمارے سالانہ امتحانات میں کوئی دو مہینے ہوں گے کہ ہفتے کے روز ٹینی کا چھوٹا بھائی اس کے ساتھ سکول میں آیا اور بھائی کے ساتھ کلاس میں بیٹھنے کے لیے ضد کرنے لگا۔ ٹینی نے اسے سمجھایا۔ گھرکیاں دیں۔ منتیں کیں اور ایک آدھ تھپڑ بھی لگا دیا مگر وہ بضد رہا اور ٹینی کو اسے اپنے ساتھ کلاس میں لے جانا ہی پڑا۔ ماسٹر گڈ پنکھ کا پیریڈ تھا۔ انہوں نے ٹینی کے ساتھ ایک بچے کو بیٹھے دیکھ کر حبیب سے اس کے بارے میں پوچھا تو حبیب نے اٹھ کر ڈرتے ڈرتے کہا۔ "جی یہ میرا بھائی ہے اور——" "لیکن گڈ پنکھ نے اس کی بات بیچ میں کاٹ دی اور دروازے کی طرف انگلی تان کر کہنے لگا۔ "اسے باہر لے جاؤ۔ یہ سکول ہے، تمہاری خالہ کا گھر نہیں۔ جاؤ۔" ٹینی نے اپنے بھائی کو بازو سے

پکڑ کر اوپر اٹھانا چاہا تو بچہ سہم کر اس کی ٹانگوں سے چمٹ گیا۔ ماسٹر جی نے میز پر رول بجا کر کہا۔ "جاؤ جاؤ لے جاؤ۔" اس حکم کے جواب میں صفدر ٹھیلا اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹینی کی سیٹ پر آیا۔ اس کے بھائی کو اپنے ساتھ اپنے ڈسک پر لے گیا اور اپنے کدو ایسے سر پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا۔ "لو ماسٹر صاحب! اب شروع کرو اپنا کام۔" کلاس ہنس پڑی اور ماسٹر جی رجسٹر اٹھا کر باہر نکل گئے۔ برکت مہاشے نے زور سے سیٹی بجا کر کہا۔ "لو جی ہمارے چھوٹے بھائی کو نکالنے آیا تھا۔ اب لالہ جی کی اپنی ارتھی نکل گئی۔ رام رام ست ہے!" لڑکوں نے چیخیں ماریں، ڈسک بجائے اور اونچے اونچے سُروں میں گانا شروع کر دیا۔ "جائے پنڈت تیری تومڑی گنگانوں۔"

پنڈت جی دفتر سے برآمد ہو رہے تھے لیکن یہ کورس سن کر واپس لوٹ گئے۔ انہوں نے جانا کہ چند لمحوں کے بعد یہ طوفانِ بدتمیزی آپ سے آپ تھم جائے گا۔ جس استاد نے کلاس کو اس طرح چھوڑ دیا ہے، وہ بدنظمی کے خوف سے خود ہی آ کر اسے سنبھالے گا لیکن یوں نہ ہوا۔ تقریباً آدھی کلاس باہر نکل گئی۔ صفدر ٹھیلا، حبیب ٹینی کے بھائی کا ہاتھ تھامے اسے روشوں پر لیے پھرتا تھا اور ان دونوں کے ساتھ ٹینی کے علاوہ جماعت کے اور بہت سے لڑکے بھی تھے۔

جب پنڈت جی کو لڑکوں کے کلاس چھوڑ کر باہر آ جانے کا علم ہوا تو وہ بید ہاتھ میں لے کر غصے سے کانپتے ہوئے دفتر سے نکلے۔ اس وقت صفدر ٹھیلا ممنوعہ گراس پلاٹ سے پھول توڑ توڑ کر حبیب ٹینی کے بھائی کی جھولی بھر رہا تھا۔ پنڈت جی بید ہاتھوں میں تھرتھراتے، نتھنے پھڑکاتے پلاٹ میں داخل ہوئے اور آتے ہی ٹھیلے کی کمر میں پورے زور سے چھڑی جڑ دی۔ اس نے تلملا کر الٹ کر دیکھا اور جھپٹ کے بید پکڑ لیا اور پھر ہیڈ ماسٹر کے ہاتھ میں چونکہ چھڑی کا چمڑا والا موٹا سرا تھا، اس لیے وہ بید چھیننے میں کامیاب ہو گئے۔ لڑکوں نے زور سے تالی بجائی۔ "پنڈت جی زندہ باد۔ ہپ ہپ ہرے، ہپ ہپ ہرے۔" لیکن ہماری ساری پارٹی بڑی خفیف ہوئی اور ہم میں سے ہر ایک تالی بجانے والوں کو گھورنے لگا۔ پنڈت جی نے منہ ہی منہ میں گالی دے کر ٹھیلا سے کہا۔ "نکل جاؤ ابھی اسی وقت نہیں تو پولیس بلواؤں گا۔"

ٹھیلا حبیب ٹینی کے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر پلاٹ سے نکلا اور آہستہ آہستہ قدم

اٹھاتا سکول سے باہر نکل گیا۔

وہ شام قیامت کی شام تھی۔ ہم سب ٹھیلے کی قیادت میں شہر سے دو میل دور سڑک کے کنارے کھجوروں کے جھنڈ میں آنے والے واقعہ کا انتظار کر رہے تھے۔ پھپھی پریتم نے اپنے جوڑے پر رومال کس کر باندھا ہوا تھا۔ اس میں اتنی پنیں لگا رکھی تھیں کہ جوڑا پن کشن بن گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شہتوت کی ایک چھڑی تھی جس پر وہ چاقو سے مسلسل رندہ کیے جا رہا تھا۔ صفدر کے ہاتھ میں بجلی کی بل کھائی ہوئی تار تھی جسے اس نے اپنی کلائی کے گرد لپیٹ کر ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ برکت مہاشے کے پاس پیتل کی ایک چھوٹی سی پھکنی تھی جو وہ اپنے ساتھ گھر سے لے کر آیا تھا۔ اس نے وہ پھکنی منہ کے آگے لگا رکھی تھی۔ اس میں آہستہ آہستہ پھونک رہا تھا۔ انور طوطا خالی ہاتھ تھا لیکن اس کے ہاتھوں میں بڑا کرتب تھا۔ جسے چاہتا کلائی پکڑ کر ایسی پچنی دیتا کہ گرے ہوئے کو گھنٹہ بھر ہوش نہ آتا۔ میری گود میں ایک ہاکی سٹک پڑی تھی اور میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ صفدر بار بار میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتا۔ "ڈر نہ تیرا تو اس میں کام ہی تھوڑا سا ہے۔" اور میں زبردستی مسکراتے ہوئے کہتا۔ "کون بھڑوا ڈرتا ہے ٹھیلے چاہے توپ کے آگے باندھ دے۔"

"شاباش۔" وہ میرا کندھا تھپک کر کہتا۔ "تو بے جگرا، تیرا باپ سورما۔ بھلا تجھے ڈر کس بات کا۔"

ہم پنڈت کی بگھی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ روزانہ شام کو سیر کے لیے نکلتے۔ چمکدار بگھی میں عربی گھوڑی سڑک پر ٹاپیں مارتی، کنوتیاں گھماتی لہر کی طرح آگے بڑھتی جاتی۔ اگلی سیٹ پر بھیا راسیں سہارے گھنٹی بجا رہا ہوتا اور پچھلی نشست پر پنڈت جی ٹانگیں پھیلائے بیٹھے ہوتے۔ پنڈت جی بلاناغہ شہر سے باہر پانچ چھ میل تک گھوڑا گاڑی میں جاتے اور ایک آدھ گھنٹہ ہرے ہرے کھیتوں میں چہل قدمی کرنے کے بعد واپس آ جاتے۔ یہی ان کا دلچسپ مشغلہ تھا اور یہی ایک ایسی ورزش تھی جسے وہ ہر چیز پر فوقیت دیتے۔

اس وقت ہم پنڈت جی کی بگھی کا انتظار کر رہے تھے اور صفدر ٹھیلے کی بے عزتی کا بدلہ چکانے بیٹھے تھے۔ صفدر خود سڑک کے درمیان کھڑا ہو کر بگھی روکنے والا تھا۔ انور طوطے کے ذمے بھیا کوچوان کو گردن سے پکڑ کر نیچے گرانے کی ڈیوٹی

تھی۔ دونوں پہیوں کے آگے اینٹیں رکھنے کا ذمہ دار برکت مہاشا تھا اور مجھے یہ حکم تھا کہ ہاکی سٹک سے گھوڑی کی ٹانگوں پر پے در پے ضربیں لگاتا جاؤں۔ باقی لوگ کمک کے طور پر تھے کہ جونہی ضرورت محسوس ہو تو سیٹی بجا کر انہیں بلا لیا جائے۔

صفدر کو مجھ پر بھروسہ نہیں تھا۔ ہنس ہنس کر کہتا۔ "مولوی گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ وہاں چاہے کچھ ہی ہو تم گھوڑی کی ٹانگوں پر نوبت بجاتے جانا۔" پھر خود ہی سوچ کر کہتا۔ "پر یار تجھ سے نوبت نہ بجے گی۔ تو ذرا زیادہ ہی سیانا ہے اور سیانوں نے بڑے گھر گالے ہیں۔ اگر ارادہ نہ ہو تو اب بتا دے، وقت پر جھمیلے میں نہ ڈال دینا۔" میں چہرے پر غصے کے بناوٹی آثار پیدا کر کے کہتا۔ "بکواس نہ کر۔ تو نے مجھے کمینہ سمجھ رکھا ہے کہ بزدل؟"

صفدر کہتا۔ "نہ تو بزدل ہے، نہ کمینہ۔ ذرا مولوی ہے نا اس لیے تشویش ہے۔"

"بس ایک بات یاد رکھنا۔ کچھ ہی ہو، ہم مریں یا جئیں تم اپنی کارروائی کیے جانا۔"

میں نے اس کی بات کا جواب نہ دیا اور مینڈھ پر پڑے ہوئے ایک بڑے سے ڈھیلے کو اپنی لکڑی سے پھوڑنے لگا۔

سورج ڈوب رہا تھا۔ نارنجی روشنی سرمئی ہوتی جا رہی تھی اور ہم سب اپنے اپنے ہتھیار سجائے کھجوروں کے جھنڈ میں ٹاپ پر کان لگائے بیٹھے تھے۔ دفعتاً صفدر نے لبوں پر انگلی رکھ کر سب کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا۔ ہم نے ہمہ تن گوش ہو کر سنا۔ پنڈت جی کی گھوڑی کھلے کھلے قدم پھینکتی چلی آتی تھی۔ اوروں کا حال مجھے معلوم نہیں، میرا دل ہر ٹاپ کے ساتھ ٹوٹی ہوئی ڈول کی طرح کھڑکھڑاتا شور مچاتا کنوئیں میں لپک رہا تھا اور کنواں ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔

اچانک ڈلکی پویہ میں تبدیل ہو گئی اور ہم صفدر کے اشارہ پر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ بجلی کی تار کو بل دیتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ ہم دم بخود کھڑے تھے۔ گھوڑی پویہ سے سرپٹ ہو گئی۔ صفدر ہمیں اشارہ کیے بغیر بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ تار کے بل اپنی کلائی سے کھول رہا تھا اور پکار رہا تھا۔ گھوڑی بے قابو ہو گئی۔ تار کھول کر اس نے پرے پھینکی اور ڈھیریاں اُلانگتا مینڈھیں پھلانگتا دونوں ہاتھ اٹھا کر سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا ہو گیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے بھاگے، گھوڑی خوفزدہ ہو کر بھاگ رہی تھی۔ بگھی کا

ایک پہیہ کچے پر اتر گیا اور گاڑی دائیں بائیں ڈول رہی تھی۔ اگلی سیٹ پر پنڈت جی اور ان کی بیوی بیٹھے تھے اور پچھلی نشست پر ان کی دونوں لڑکیاں ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی چیخیں مار رہی تھیں۔ پنڈت جی دونوں ہاتھوں سے راسیں کھینچ رہے تھے مگر چنگاریاں اڑاتی ٹاپیں تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ پنڈت جی کی پگڑی کھل کر ان کے گلے میں لٹکنے لگی تھی اور اب وہ بھی بچاؤ کی صدائیں بلند کرنے لگے تھے۔ ٹھیلا دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے سڑک کے درمیان کھڑا تھا اور ہم سب اپنے اپنے ہتھیار سنبھالے ہوئے ذرا دور ایک درخت کے نیچے جمع تھے۔ جونہی گھوڑی نے کسی کو راستہ روکے دیکھا، اس نے رفتار اور تیز کر دی۔ ٹھیلا جھلائے عقاب کی طرح آگے جھپٹا اور اُچھل کر گھوڑی کا دھانہ پکڑ لیا۔ گھوڑی الف ہو گئی اور زور سے ہنہنائی اور جھنجلا کر سر جھٹکا۔ ٹھیلا کی گرفت چھوٹ گئی اور سڑک کے بیچوں بیچ گرا۔ گھوڑی کا ایک سم اس کے ماتھے پر اور دوسرا چھاتی پر پڑا۔ پل بھر کو اس کی روشن آنکھیں اپنی پوری بے تابی سے چمکیں اور بند ہو گئیں۔ گھوڑی نے ایک مرتبہ پھر بیخ پا ہو کر سنگین سموں سے چھاتی اور پیٹ کو کچل ڈالا۔ صفدر اس کی ٹانگوں کے درمیان پڑا تھا۔ بگھی تھم گئی تھی اور پنڈت جی الجھا ہوا صافہ گلے سے علیحدہ کرتے ہوئے گاڑی سے اُتر رہے تھے۔ سڑک پر خون کی سُست رو ندی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ ٹھیلا کے ماتھے پر خون تھا۔ گھٹے ہوئے سر پر خون تھا اور گھوڑی کے سموں پر خون تھا۔ پنڈت جی گاڑی کے پہلو میں کھڑے اپنی بیوی اور لڑکیوں کی طرف دیکھ دیکھ کر چلا رہے تھے۔ "میرا سٹوڈنٹ ہے صفدر — میرا سٹوڈنٹ — صفدر میرا سٹوڈنٹ۔"

اور صفدر گھبرائی ہوئی گھوڑی کے قدموں میں بے حس و حرکت پڑا تھا۔ ہم سب اس کے ارد گرد اپنے اپنے ہتھیار سنبھالے کھڑے تھے۔ ہاکی سٹک میرے ہاتھوں سے پھسلی جا رہی تھی۔ میں نے اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے صفدر کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس نے گویا مسکراتے ہوئے کہا۔ "نہ تو بزدل ہے نہ کمینہ، ذرا مولوی ہے نا، اس لیے تشویش ہے۔ بس ہم مریں یا جئیں تم اپنی کارروائی کیے جانا۔"

میں نے کارروائی کے لیے بازوؤں کو تولا تو ہاکی میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر ایسے گری جیسے صفدر گرا تھا۔

☆-------------☆

اُجلے پھول

کیسی اُجلی چاندنی پھیلی ہے۔ کتنے پیارے پھول کھلے ہیں اور کیا لپکتا لہکتا گیت ہے کہ ابابیل کی طرح اوپر ہی اوپر جاتا ہے۔ یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ اس وقت مَیں اکیلی پھول چننے کیلئے آئی ہوں‘ اور جب ٹوکری بھر کر اندر لوٹوں گی تو اکیلے ہی بیٹھ کر انہیں گوندھوں گی۔ آپی سے تو اتنا بھی نہ ہو گا کہ سوئی میں دھاگہ ڈال کر مجھے دیتی جائے یا رنگ برنگی ڈوریں ہی بٹتی رہے۔ میرا اس کا بہناپا تو جنم سے ہی ختم تھا۔ آج سکھیاپا بھی ختم ہو گیا۔ پچھلے ہی سال کی تو بات ہے۔ میں نے یہیں انہی پیڑوں سے ایسی ہی چاندنی رات کو کتنی ہی کلیاں توڑی تھیں۔ ساری رات آپی کے ساتھ بیٹھ کر کیسی کیسی لمبی لڑیاں گوندھی تھیں‘ بار بار اُٹھ کر ان پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیئے تھے اور ان ساری لڑیوں کو کیسے سلیقے سے تہہ کر کے ٹوکری میں رکھا تھا اور اس وقت جب میری باری آئی تو آپی نے مسکرا کر ٹال دیا اور آئینے کے آگے بیٹھ کر بڑے اطمینان سے بال کھولنے لگیں اور میں بے وقوف بچے کی طرح اتنی دیر ان کے پہلو میں کھڑی رہی کہ شاید ان کا ارادہ بدل جائے لیکن انہوں نے میری موجودگی تک کا احساس نہ کیا اور آرام سے بال کھولے گئیں۔ اور اب میں اکیلی بالکل اکیلی یہاں پھول چننے آئی ہوں۔ پر مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں اپنے بنگلے کی پھلواری میں آپ ہی چوری کرنے آئی ہوں۔ چاند کی کتنی ہی پوری ادھوری کرنیں ایک ایک کلی کی طرف اشارہ کر کے کہتی ہیں ’اسے توڑو‘ اسے چنو اور جب وہ کلیاں میری چٹکی میں آ کر شاخ سے علیحدہ ہو جاتی ہیں تو وہی پوری ادھوری کرنیں سرگوشیاں کرتے ہوئے پیڑ کی جڑ سے جا لپٹتی ہیں۔ ہم نے کسی کو کچھ نہیں کہا۔ یہ لڑکی چوٹی ہے‘ اسے منہ بند کلیوں اور نیم شگفتہ پھولوں کا آپ ہی علم ہے۔ یہ

اندھیرے اجالے میں یکساں ہاتھ صاف کر سکتی ہے۔ ہر شاخ کو جانتی ہے‘ پہچانتی ہے۔ ہم نے کسی کو نہیں بتایا‘ کسی سے نہیں کہا اور پروائی چلتی ہے تو ایک ہی پیڑ کی شاخیں سر ہلا ہلا کے کہتی ہیں۔ اچھا چھا!! نہیں نہیں اور گیت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ابابیلوں کی طرح اوپر ہی اوپر چڑھتے جاتے ہیں۔

گرمیوں کی ایک ایسی ہی چاندرات کو آپی، آلا جی اور میں یونیورسٹی میں آپی کا نتیجہ دیکھنے گئے تھے۔ گیٹ میں داخل ہوتے ہی آپی کے پیٹ میں درد اُٹھنے لگا تھا اور وہ پھاٹک کی برجی کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ آلا جی اور میں انہیں اسی طرح چھوڑ کر آہستہ آہستہ نوٹس بورڈ کے پاس پہنچی تھیں اور بسم اللہ پڑھ کر آپی کا رول نمبر دیکھنے لگی تھیں۔ رول نمبر فہرست میں موجود تھا اور آپی نے بڑی اچھی سیکنڈ ڈویژن پائی تھی۔ میں آلا جی کو اسی طرح جھنجھوڑ کر چلانگیں مارتی ہوئی پھاٹک کی طرف بھاگی اور آپی سے لپٹ گئی۔ میں نمبروں کی گردان کیے جاتی تھی۔ چند لڑکے ہمیں اسی طرح دیکھ کر سائیکلوں کی گھنٹیاں بجانے لگے تھے اور آپی نہیں نہیں کیے جاتی تھیں۔ آلا جی کے کہنے پر آپی کو ذرا سا اعتبار آیا مگر یقین اس وقت ہوا جب اگلی صبح انہوں نے اپنا رول نمبر اپنی آنکھوں سے اخبار میں دیکھ لیا۔ ڈیڈی دورے پر گئے ہوئے تھے لیکن آپی کا نتیجہ دیکھ کر پہلے ہی ڈاک بنگلے سے واپس لوٹ آئے اور آپی کے داخلے کے بارے میں میٹنگ ہونے لگی۔ ہم سب آپی کے میڈیکل کالج میں داخلہ لینے پر زور دے رہے تھے اور آپی ایک ہی بات پر اڑی ہوئی تھیں کہ اب چاہے کچھ ہی ہو، میں آگے نہ پڑھوں گی۔ ایم-بی-بی-ایس کا نام سن کر تو وہ کانوں پر ہاتھ دھرتی تھیں کہ بی-ایس-سی کرنے کے بعد ایم-بی-بی-ایس میں داخلہ لینا بڑا ہی خجالت آمیز کام ہے — کہتی تھیں اس میں رسوائی کے سوا کچھ نہیں کیونکہ ڈاکٹر بننے کے بعد پریکٹس یا نوکری کے دوران میں اگر کسی کو پتہ چل گیا کہ بی-ایس-سی، ایم-بی-بی-ایس ہوں تو لوگ سمجھیں گے کہ ایف-اے میں تھرڈ ڈویژن لی ہو گی۔ میڈیکل کالج میں داخلہ نہ ملا ہو گا۔ اسی لیے بی-ایس-سی کیا گیا اور یہ بات ہے بھی ٹھیک۔ اگر ایف-ایس-سی میں میری فرسٹ نہ سہی، سیکنڈ ڈویژن ہی آ جاتی تو میں ضرور ڈاکٹر بنتی لیکن اب اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ڈیڈی نے لاکھ سمجھایا، خوشامد کی، قدرے تلخی سے پیش آئے لیکن آپی

نے ایک نہ مانی!اور ڈیڈی واپس دورے پر چلے گئے۔ان کی روانگی کے بعد آلاجی بڑی ہی دبی زبان میں آپی کو داخلے پر آمادہ کرتی رہیں مگر ان کی کونسلنگ کا نتیجہ خاک بھی نہ نکلا! ایک شام چائے کے بعد جب آلاجی نے پھر درخواست کی اور آپی نے وہی جواب دیا تو آلاجی نے آپی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور بڑے پیارے لہجے میں انگریزی میں پوچھا۔ "میری پیاری بچی تمہیں کسی سے محبت تو نہیں؟" آپی ہنس پڑیں اور آلاجی کا ہاتھ تھپتھپا کر کہنے لگیں۔"جب ہوگی تو سب سے پہلے آپ ہی کو بتاؤں گی۔"

آلاجی بڑی ہی شفیق ماں تھیں۔ہم سب انہیں آلاجی اس لیے کہتے تھے کہ ڈیڈی کے قیامِ لندن کے دوران میں ہم اپنی خالہ کے یہاں رہے۔خالہ کے چھوٹے بچے چونکہ ہماری امی کو آلاجی کہتے تھے،اس لیے ہم بھی انہیں آلاجی کہنے لگے تھے۔ہم تو ہم امی کے سب بھائی بہنیں انہیں اسی نام سے پکارنے لگے اور امی کا نام خاندان بھر میں مشہور ہو گیا۔آلاجی اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی تھیں اور اپنے خاندان کی سب سے پہلی گریجوایٹ خاتون!ان کا برتاؤ ہمارے ساتھ ہمیشہ دوستانہ رہا۔نہ کبھی کسی بات پر ٹوکا،نہ کسی قسم کی تکلیف ہونے دی۔ہمارے ساتھ ہر قسم کے کھیلوں میں شرکت کی۔ہر طرح کی پارٹیوں میں ہمارا ساتھ دیا اور کبھی محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ ہماری ماں ہیں اور ہمیں ان سے دب کر یا مرعوب ہو کر رہنا چاہیے۔میرے ساتھ وہ زندگی میں صرف اس وقت سختی سے پیش آئیں جب میں میٹرک کے امتحان میں فیل ہو گئی تھی۔انہوں نے میرا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر درشتی سے کہا۔"اگر روؤ گی تو گھر سے نکال دوں گی اور زندگی بھر تمہاری شکل نہ دیکھوں گی۔"میں خوفزدہ ہو گئی اور ان کے سامنے بظاہر ہنستی کھیلتی رہی۔اس کے بعد انہوں نے مجھے سکول سے اٹھا لیا اور گھر پر خود پڑھانے لگیں اور اس وقت تک میری جان نہ چھوڑی جب تک امتحان کا نتیجہ نہ نکل گیا۔ان کے پڑھانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔یہی جی چاہتا کہ آلاجی سوال حل کرتی جائیں اور ہم دیکھتے رہیں۔وہ نظمیں پڑھتی جائیں اور ہم سنتے رہیں۔

انجم بھائی نے ایم۔اے کے فوراً بعد سنٹرل ایکسائز میں نوکری کر لی اور وہ تمباکو انسپکٹر ہو کر ہمارے یہاں آ گئے۔جب میں نے انہیں آخری مرتبہ دیکھا تھا تو وہ کالج میں نئے نئے داخل ہو کر چھٹیاں گزارنے ہمارے پاس آئے تھے اور مجھے پنسلیں بنا

بنا کر دیا کرتے تھے۔پہلے بڑے سلیقے سے پنسل کے ارد گرد چاقو سے ایک دائرہ بناتے، پھر اس چکر سے آگے بلیڈیوں چلاتے جیسے کشمیری کاریگر اخروٹ کی لکڑی پر کام کرتے ہیں۔کوئی پہچان نہیں سکتا کہ چاقو سے تراشی گئی ہے یا پنسل تراش سے۔کہانی کہنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔جیسی چاہو جس فقرے سے کہو،کہانی شروع کر دیتے۔بے تکان بولتے چلے جاتے۔گویا امیر خسرو نثر لکھ رہے ہیں۔جس کردار کو ایک مرتبہ پیچھے چھوڑ دیا،پلٹ کر اس کی سار نہ لی۔جس مقصد کیلئے شہزادہ گھوڑے پر زین ڈال کر نکلتا، اس کو بھول بھال کر گلی ڈنڈا کھیلنے لگ جاتا اور آدھی رات کو چور دروازے سے گھر آ کر چپ چاپ سو جاتا۔ان کی کہانی ہمیشہ اس فقرے پر ختم ہوا کرتی کہ "جب شہزادے نے شہزادی کو جنوں کی قید سے چھڑوا لیا اور اپنے اردلی کو فرسٹ کلاس کا کرایہ دے کر شہزادی کو اس کے دیس بھجوا دیا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا اور ہنسی خوشی اکیلا زندگی گزارنے لگا۔"

اب کے جو انجم بھائی آئے تو کچھ اور ہی طرح کے۔جیسے مردانہ کپڑے سینے والے ٹیلر ماسٹر ہوں۔کچھ ٹیلر سے کچھ ماسٹر سے!پنسل تراشنا تو ایک طرف وہ تو اپنی پرانی چال بھی بھول گئے تھے۔چلتے تو ایسا لگتا جیسے ڈاکیہ چٹھیاں تقسیم کرنے جا رہا ہو۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور سب سے پہلے سوال جو میں نے ان سے کیا،وہ ان کی اسی چال کے بارے میں تھا۔انجم بھائی مسکرائے اور بوٹ اتارتے ہوئے بولے "توبہ توبہ وہ بھی کوئی چال تھی،کوئی روش تھی۔بڑی ہتیا ہوئی،بڑا پاپ کیا۔"پھر میری طرف دیکھ کر آنکھیں نچاتے ہوئے بولے "جب سے بدھ مت اختیار کیا ہے،اسی طرح چلنا شروع کر دیا ہے۔اس سے داتا بھی خوش اور کیڑے مکوڑے بھی راضی"—— پھر انہوں نے انگلی اوپر اٹھائی اور ڈکار لینے کے انداز میں کہا" آہنسا پرمو دھرما——"

یہ بات سن کر مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ شکر ہے انجم بھائی کی طبیعت نہیں بدلی۔اگر خدانخواستہ اس کا بھی نروان ہو جاتا تو کس کی ہمت تھی جو انہیں راہِ راست پر لاتا۔وہ جس رو میں بہہ نکلتے،بس بہہ ہی جاتے——میں نے بڑی خوشامدوں اور سماجتوں کے بعد ان کی چال ٹھیک کی۔بیرے کو سخت تاکید کی کہ ہر صبح شیو کے لیے انہیں گرم پانی پہنچایا کرے۔ان کا سوٹ میں ہر روز باقاعدگی سے استری کرنے لگی اور انجم بھائی

پھر پہلے سی پنسلیں تراشنے لگے اور اگلے جیسی کہانیاں کہنے لگے ہر روز شام کو آلا جی، آپی، اور انجمن بھائی اور میں لان میں کرسیاں ڈال کر حالات حاضرہ پر گرما گرم بحثیں کیا کرتے۔ جب دلائل کمزور ہو جاتے تو ہم پنچم میں بولنے لگتے۔ انجم بھائی اپنی آواز کو پاٹ دار بنا کر "مَیں کیسے مان لوں، مَیں کیسے مان لوں!" کا ورد شروع کر دیتے۔ آلا جی اپنا ہاتھ ذرا سا اوپر اٹھا کر کہتیں "آہستہ بچو آہستہ۔ پہلے بات کرنے کا سلیقہ سیکھو، اس کے بعد بحث کرنا۔" ڈیڈی گھر پر ہوتے تو وہ بھی اس مجلس میں ضرور شرکت کرتے۔ انہوں نے اپنے لڑکپن میں خلافت کا زمانہ دیکھا تھا، اس لیے ان کے خیالات ہم سب سے مختلف تھے۔ آپی ہر ملک کے بازوئے شمشیر زن کی نرو آگے بڑھاتیں اور میں برلن ریڈیو اسٹیشن کی اردو تقریروں کا حوالہ دے کر اپنی ہانکے جاتی۔ انجم بھائی ہر حال میں میرا ساتھ دیتے اور بُدھ ہونے کے باوجود ہٹلر کی تعریف میں قصیدے پڑھے جاتے۔ آلا جی ماں تھیں، اس لیے جنگ سے متنفر تھیں۔ انجم بھائی ہوا میں مُکّا بلند کر کے کہتے۔ "طارق ابنِ زیاد واہ واہ۔ خالد بن ولید سبحان اللہ" اور آلا جی کو خاموش ہو جانا پڑتا۔ آپی انجم بھائی کی اس رنگ بدلتی پالیسی پر سخت برہم ہو کر مسکرانے لگتیں۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں پوری کھل جاتیں اور شربتی پتلیاں اِدھر اُدھر یوں ڈولتیں جیسے دودھ کے کٹورے پر نیل کے قطرے ہٹکورے لے رہے ہوں اور میرا جی چاہتا کہ آپی کو گلے لگا کر ان کی آنکھیں چوم لوں۔ ان دیئوں کی ایسی جوت تھی کہ کالے کے روبرو اور جگتی، خوشی میں اور لہکتی اور برہمی میں سارا چہرہ گلستاں کر دیتی۔ ایک دن میں انجم بھائی اور آپی فلاش کھیل رہے تھے۔ پیسہ پوائنٹ کی بازی لگی ہوئی تھی اور بھائی ہارے چلے جا رہے تھے۔ جیبیں خالی ہو جانے پر دھیلا پوائنٹ کی درخواست کی۔ ہم نے گتے کے ٹکڑے کاٹ کر دھیلے بنا لیے اور کھیل شروع ہو گیا۔ خدا جانے ان کاغذی سکوں پر انجم بھائی کو کیسی دسترس تھی کہ نہ صرف اپنی ہاری ہوئی رقم واپس لوٹالی بلکہ ہمارے پیسے بھی جیتنے شروع کر دیئے۔ آپی کے سارے پیسے ختم ہو گئے تو بھائی نے کہا۔ "بس ٹائیں ٹائیں فش!" آپی نے کہا۔ "توبہ کرو، ابھی تو میرے بکس میں تین روپے پڑے ہیں۔" انجم بھائی نے سر جھٹک کر اور ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔ "تو لاؤ پھر دیر کس بات کی ہے!" آپی روپے لے آئیں تو بازی پھر شروع ہو گئی۔ بھائی کی قسمت یاور تھی، انہوں نے وہ بھی جیت لیے اور تاش کو ڈبیا

میں بند کرتے ہوئے کہا۔ "بس طلّو ہار گئیں؟"

آپی نے مسکرا کر جواب دیا۔ "واہ انجی میں کیوں! ہار گیا سرکار کا سکہ۔ میرا کیا گیا بھلا؟"

بھائی نے کہا۔ "کوئی بھی ہارا، ہار گیا۔ طلّو! میرا مطلب تھا یہ آثار ذرا اچھے نہیں ہوتے۔"

آپی نے کچھ کہنا چاہا اور وہ چُپ ہو گئیں اور ان کی آنکھوں کے دیئے کچھ ایسے جگمگائے جیسے ان میں تیل کی بجائے شبنم پڑی ہو! اور میرا جی خدا جانے کیوں چاہا کہ ان آنکھوں کو روتے ہوئے بھی دیکھوں۔

یا تو انجم بھائی سے میری بچپنے کی دوستی تھی یا اب وہ ایسے جان بچانے لگے جیسے مجھے چھوت کی بیماری ہو۔ کسی نہ کسی بہانے مجھے کام پر لگائے رکھتے اور آپی سے باتیں کرتے رہتے۔ پتہ نہیں آپی سے گپیں ہانک ہانک کر ان کا جی کیوں نہ بھرتا تھا۔ میرے لیے گھڑی ہوئی ساری کہانیاں انہیں سنائے جاتے۔ آپی بظاہر طرح دیئے جاتیں، پر ان کا دھیان کہانی میں ہوتا اور جب بھائی گھڑی کی طرف دیکھ کر کہتے "اوہو مجھے تمباکو کا ایک گودام چیک کرنے جانا ہے۔" تو آپی آہستہ سے کہتیں۔ "کوئی ضرورت نہیں، چوہے نہیں کھا جاتے آپ کا تمباکو، کل چیک کر لینا۔"

"کل!" بھیّا حیران ہو کر کہتے۔ "کل کا کیا بھروسہ، آئے آئے نہ——"

اور آپی بات کاٹ کر کہتیں۔ "نہ آئے تو نہ سہی۔"

بھائی ہنس کر کہتے۔ "طلّو حضور! یہ نوکری ہے جاگیرداری نہیں۔"

آپی جوت جگا کر کہتیں۔ "تو جاؤ پھر۔"

اور انجم بھائی سنجیدگی سے کہتے۔ "کل سہی، کل کون سی دُور ہے۔"

پھر وہ کل پورے ایک ہفتے کے بعد آتی۔

آپی بچاری تھیں تو ادب کی دلدادہ لیکن ڈیڈی نے زبردستی انہیں ایف-ایس-سی میڈیکل لے دیا تھا۔ گریجوایٹ ہونے کے بعد جب انہوں نے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا تو ادب کے معاملے میں جی بھر کے حسرتیں نکالیں۔ لائبریری سے ایسی ایسی کتابیں لاتیں کہ انہیں دیکھ کر طبیعت مالش کرنے لگتی۔ کچھ پرانی نولکشوری

کتابیں، کچھ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے کی اردو کی کتابیں جنہیں میں ایک عرصہ تک عربی کی کتابیں سمجھتی رہی اور کچھ ایسے قصے جن کے پبلشر تو ایک طرف، مصنفوں کے نام بھی معلوم نہ تھے۔ ان کے بعد اچانک ایک دن جو پنجابی زبان کے مطالعے کا بھوت سوار ہوا تو جلتی دوپہر میں نوکر کو "اصلی تے وڈی ہیر" لانے کے لیے بازار روانہ کر دیا اور جب تک وہ کمبخت کتاب آ نہیں گئی، دو دو منٹ بعد پھاٹک کے چکر ہوتے رہے اور جب ایک مرتبہ اس تحریر کو روانی سے پڑھنے کا محاورہ ہو گیا تو اسی بنگلے میں قدم قدم پر پنجابی کے قصے اور گیتوں، بولیوں کی کتابیں یوں پڑی ملتی تھیں جیسے سیّد وارث شاہ بمعہ اپنے کتب خانے کے ہمارے یہاں مہمان ہوں۔

شام کو حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ مفقود ہو گیا اور اس کی بجائے اردو، انگریزی اور پنجابی کے ہم معنی اشعار سنائے جانے لگے۔ آلا جی کو انگریزی شاعری پر بڑا عبور تھا۔ وہ ہر شعر کے مقابلے میں تقریباً ویسا ہی انگریزی کا ٹکڑا ڈھونڈ نکالتیں اور آپی ان کا امتحان لینے کے لیے پنجابی رسیلے گیت اور انوکھے ٹپے سنائے جاتیں۔ دو تین دن تک یہ محفل یونہی گرم ہوتی رہی اور اس کے بعد انجم بھائی کی رائے سے گھر "مجلسِ اہلِ قلم" کی بنیاد رکھ دی گئی۔ سیکرٹری شپ کا قرعہ میرے نام پڑا اور کارروائی لکھنے کے لیے ایک خوبصورت سی کاپی میرے حوالے کر دی گئی۔ سب سے پہلی مجلس کی صدارت آلا جی نے کی۔ آپی نے ایک افسانہ 'زندانیٔ تقدیر' پڑھا جس پر بڑی دیر تک بحث ہوتی رہی۔ انجم بھائی اقبال کے اشعار پڑھ پڑھ کر یہ ثابت کر رہے تھے کہ انسان زندانیٔ تقدیر نہیں بلکہ تقدیر یزداں ہے اور قسمت، تقدیر، مقدر سب بے معنی چیزیں اور بے ہودہ خیال ہیں۔ صاحب صدر نے اکثر سخت الفاظ پر انجم بھائی کو ٹوکا اور وہ معذرت کرتے ہوئے اپنی تقریر جھاڑتے رہے۔ چونکہ تبصرے پر غیر معمولی وقت صرف ہو گیا، اس لیے میرے مضمون کی باری نہ آئی اور صاحبِ صدر کی مختصر سی تقریر اور طویل دعاؤں کے بعد مجلس برخاست ہو گئی۔

انہی دنوں کی بات ہے گرمیوں کی چھٹیوں میں ہمارے ہاں للا ماموں آ گیا۔ یہ آلا جی کا رشتہ کا بھائی تھا اور آپی سے دو سال چھوٹا۔ ہم اسے للا ماموں اس لیے کہتے تھے کہ ایک تو اس کا رنگ کنہیا جی ایسا تھا۔ دوسرے بی-اے کا طالب علم ہونے کے باوجود بڑا

میاں آدمی تھا۔ چالیس چالیس مضمون کی آزاد نظمیں رقم کرتا اور ان کے نیچے "باقی پھر" لکھ دیتا۔ اس کی آمد سے ہماری مجلس میں جان پڑ گئی۔ للا ماموں نظم سنا رہا ہے اور ہم سب برداشت کیے جاتے ہیں۔ تبصرے کی باری آتی ہے تو سنبھل کر بیٹھ جاتا اور تنقید کرنے والے کی آنکھوں میں آنکھیں یوں ڈالتا کہ بچارا چوکڑی بھول جاتا۔ ایک مرتبہ ہم نے اسے صدر بھی بنایا لیکن اس نے آغازِ مجلس کو انجامِ مجلس بنا دیا۔ سارے بنگلے کی بتیاں روشن ہو گئیں اور ماموں کا شکریہ صدارت انجام پذیر نہ ہوا۔ ہم نے ان پر لیٹ شو کی پینلٹی لگا دی۔ رات کے وقت ہم سب اپنے اپنے جوتے بغلوں میں دبائے آلا جی اور ڈیڈی کو سوتا چھوڑ کر سینما چلے گئے۔ للا ماموں نے فلم دکھائی، آئس کریم کھلائی اور انجم بھائی نے پان کا خرچ برداشت کیا۔ واپسی پر ہم سب اس بنگلے کا جنگلہ پھاندنے والے تھے کہ پلوٹو جاگ اُٹھا اور اٹھائی گیروں کے اس گروہ کو دیکھ کر بھونکنے لگا۔ ادھر پلوٹو اپنی پوری قوت سے بُڑبڑ کرتا، ادھر انجم بھائی ہاتھ سر پر رکھ کر کہتے "وعلیکم بؤبؤ" میں اور آپی ایڑیاں اٹھا اٹھا کر ان کے منہ پر ہاتھ دھرتیں لیکن وہ ہمارے ہاتھ جھٹک کر "وعلیکم بؤبؤ، وعلیکم بؤبؤ" کہے جاتے۔ نوکر چاکر آلا جی، ڈیڈی سب جاگ اٹھے اور ہماری چوری پکڑی گئی۔ اگلی صبح آلا جی نے مجھے اور آپی کو بلا کر صرف اسی قدر کہا۔ "تم مشرق کی بیٹیاں ہو، یورپ کی گلیمر گرلز نہیں ہو اور مشرقی بیٹیاں بڑوں سے پوچھے بنا کہیں نہیں جاتیں۔" پھر انہوں نے ہمیں اپنے ساتھ لپٹا لیا اور ہولے سے کہا۔ "بُرا نہ ماننا، میں نے ٹھیک ہی کہا ہے۔" اس کے بعد آپی کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئیں۔ پتہ نہیں انہوں نے آلا جی سے کیا کہا ہو گا لیکن مجھے بڑی مدت کا ایک منظر رہ رہ کر یاد آ رہا تھا۔ جب آلا جی نے آپی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا تھا۔ "میری بچی! تمہیں کسی سے محبت تو نہیں؟" شاید انہیں یہی بات بتانے کے لیے اندر لے گئی ہوں مگر اس دن آپی کا چہرہ بشاش ہونے کے بجائے کچھ مرجھا سا گیا۔ انجم بھائی کے ابا جی سے ہمارے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں۔ بے معنی اور مہمل سی جو اکٹھی ہو ہو کر تلخ سے تلخ تر ہو گئی تھیں۔ شاید آلا جی نے وہ ساری باتیں ایک ایک کر کے آپی سے کہی ہوں اور پھر اس کے دونوں ہاتھ تھام کر کہا ہو۔ "اب بتاؤ رانی! میں کیا کروں؟ تم ہی کہو ٹلو یہ کیونکر ہو؟"

شاید یہ باتیں نہ بھی ہوئی ہوں، پر آپی کا چہرہ دن بھر اترا رہا اور انہوں نے ہم میں سے کسی کے ساتھ کھل کر بات نہ کی۔

پھر ایک مرتبہ للا ماموں کی صدارت میں مجلس منعقد ہوئی۔ ڈیڈی دورے سے آئے ہوئے تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ اہلِ قلم نہیں تھے۔ ہم نے انہیں ''اسپیشل کیس'' بنا کر محفل میں بیٹھنے کی اجازت دیدی۔ انجم بھائی نے ایک افسانہ لکھا تھا۔ افسانہ تو خیر ان کی کہانیوں کی طرح بے سروپا تھا لیکن زبان بڑی پیاری تھی۔ بھائی فارسی کے آنرز تھے اور انہوں نے ایسی پیاری ترکیبوں اور استعاروں سے عبارت سجائی تھی کہ سب کو مزا آگیا۔ ڈیڈی ایک ایک فقرے پر سر دھنتے اور خوب! بہت خوب! کہہ کر داد دیتے جاتے۔ افسانہ ختم ہو چکا تو آپی نے ہولے سے کھنکار کر کہا۔ ''صاحبِ صدر مجھے اس افسانے کی زبان کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔'' ہم سب حیران ہو کر آپی کا منہ تکنے لگے۔ للا ماموں نے تیوری چڑھا کر کہا۔ ''ارشاد!''

آپی نے کہا۔ ''بظاہر یہ افسانہ اردو زبان میں لکھا گیا ہے لیکن در حقیقت ایسا نہیں ہے۔ یہ فارسی زبان کا بہت ہی بڑا ذخیرۂ الفاظ ہے۔ حسنِ اتفاق سے اس میں چند مصادر اردو کے بھی آگئے ہیں جنہوں نے سامعین کو یہ سوچنے کا موقع نہیں دیا کہ کہانی غیر ملکی زبان میں لکھی گئی ہے۔''

للا ماموں نے بات کاٹ کر کہا۔ ''محترمہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری زبان فارسی اور دیگر بولیوں کے تال میل سے بنی ہے۔''

آپی نے اسی انداز میں کہا۔ ''صاحبِ صدر اس سے کسی کو انکار نہیں ہے لیکن یہاں تو دیسی بولی کی پٹ سرے سے نہیں ملتی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ محترم افسانہ نگار نے ہم لوگوں پر اپنی علمیت اور زبان دانی کا سکہ بٹھانے کے لیے یہ کاوش کی ہے۔ افسانہ ایسی زبان کا ہرگز متحمل نہیں ہوتا۔ ہاں فنِ خطابت کے تقاضوں——''

اب کے انجم بھائی نے ٹوک کر کہا۔ ''صاحبِ صدر کہنے والی بات کیسی ہی خیال انگیز کیوں نہ ہو، جب تک اعتماد اور وثوق سے نہ کہی جائے گی، وہ قاری یا سامع کو کبھی بھی متاثر نہیں کر سکتی۔''

آپی نے مسکرا کر کہا۔ ''صاحبِ صدر اگر اعتماد اور وثوق انگریزی میں،

فرانسیسی اور اردو میں فارسی الفاظ کے استعمال کرنے کا نام ہے تو شاید محترم افسانہ نگار ٹھیک کہتے ہوں لیکن اگر ان کی مراد اسلوب اور اظہار سے ہے تو میں یہ عرض کیے بغیر نہ رہوں گی کہ انہوں نے بڑے ہی ناپائیدار سحر سے مسحور کرنے کی کوشش کی ہے۔''

ڈیڈی نے انجم بھائی کے تیور دیکھ کر کہا۔ ''طلّو بیٹا اگر——''

اور مَیں نے بحیثیت سیکرٹری ڈیڈی کو متنبہ کیا کہ ''یہاں کوئی براہِ راست کسی سے گفتگو کرنے کا مجاز نہیں، آپ کو جو کچھ کہنا ہے صدر صاحب سے مخاطب کر کے کہیے۔''

ڈیڈی نے ''آئی ایم سوری! آئی ایم سوری!!'' کہتے ہوئے صدر کو مخاطب کیا اور کہا۔ ''صاحبِ صدر میرا خیال ہے کہ وقت کافی ہو چکا ہے اس لیے مجلس برخاست کر دی جائے۔''

مجلس برخاست ہو چکی تو انجم بھائی سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے اور مجلس کے بعد جو باتیں ہوا کرتی تھیں، وہ نہ ہو سکیں۔

اگلے دن ڈیڈی اور آلا جی کو کسی نے دوپہر کے کھانے پر بلایا تھا۔ آپی ڈرائنگ روم کی نئی تشکیل میں مصروف تھیں اور میں فرمائشی پروگرام سن رہی تھی کہ اچانک مجھے انجم بھائی کا خیال آیا انہوں نے کسی دوست کے ہاں سے کیمرہ لانے کا وعدہ کیا تھا۔ میں ریڈیو کو اسی طرح کھلا چھوڑ کر مختلف کمروں میں سے ہوتی ہوئی بھائی کے کمرے کے پاس پہنچی تو مجھے آپی کی آواز سنائی دی۔ میں نے پردے کے ساتھ لگ کر اندر جھانک کر دیکھا۔ انجم بھائی قالین پر بیٹھے سنڈے سٹینڈرڈ سے تصویریں کاٹ کاٹ کر ایک بڑے سے رجسٹر پر چپکا رہے تھے۔ آپی ان کے پیچھے کھڑی تھیں اور بھائی کے کندھے کو اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے بار بار چھو کر کہہ رہی تھیں۔ ''بولتے کیوں نہیں—— بولتے کیوں نہیں؟''

اور انجم بھائی بڑے انہماک سے قینچی چلا رہے تھے اور ایسے بیٹھے تھے جیسے کسی کی موجودگی کا واقعی ان کو احساس نہ ہو۔ آپی نے ان کے سنہرے سنہرے بالوں کو اپنی مٹھیوں میں پکڑ کر زور زور سے جھٹکے دیئے اور پھر کہا۔ ''بولتے کیوں نہیں—— بتاؤ ناں، بولتے کیوں نہیں؟''

انجم بھائی اس پر بھی نہ بولے تو آپی نے اسی طرح بال پکڑے پکڑے اپنے دونوں زانوں ان کے کندھوں پر رکھ دیے۔ ایک ثانیے کے لیے وزن تولا اور پھر ہلکے ہلکے جھونٹے لے کر ہولے ہولے گانے لگیں۔

ہتھ جوڑا پکھیاں دا
نالے ساڈا ماہی لگدا نالے چانن اکھیاں دا

جب انہوں نے اسی طرح ہلورے دیتے ہوئے پانچویں یا چھٹی مرتبہ یہی شعر پڑھا تو انجم بھائی نے قینچی زمین پر رکھ کر کہا۔ "خدا کی قسم تم بہت وزنی ہو۔" آپی نے تُھولا بند کر کے کہا "کھانا کھاتی ہوں، کوئی تمباکو سونگھ کر نہیں جیتی۔"

انجم بھائی نے کہا۔ "کھانا تو خیر ہم بھی کھاتے ہیں لیکن ایسے بوجھ تم پر نہ لاتے ہوں گے۔"

آپی ہنسیں اور زور زور سے ہلورے لینے لگیں۔ بھائی نے ہاتھ بڑھا کر اسے بالوں سے پکڑا اور نیچے کھینچتے ہوئے بولے۔ "آپی کی بچّی مجھے استری کر ڈالا، نیچے اُتر——"

"اور پھر انہیں ہلکا سا جھٹکا دیا۔ آپی بوری کی طرح نیچے گریں اور گرتے ہی پٹ پٹ انجم بھائی کی ران پر چپے کے کتنے ہی ہاتھ چلا دیے اور پھر وہیں سر رکھ کر لیٹ گئیں۔ انجم بھائی نے قینچی پوری طرح کھول کر آپی کی ناک دونوں پھلوں کے درمیان آہستہ سے پکڑ لی اور کہنے لگے "یہ تم جو نانیوں جیسی ناک لیے پھرتی ہو نا، ایک منٹ میں سون چڑی کی طرح اڑ سکتی ہے۔"

آپی نے نکٹوں کی سی آواز نکال کر کہا۔ "کتنے شلغم کی بات ہے کہ ایک قبوغ صوغت عوغت کی ناک اُغادی جائے۔"

"قبول صورت۔" انجم بھائی نے کہا۔ "ذرا اپنی صورت تو دیکھو آئینے میں—— اگر پپوٹوں کی ایک جنبش پر کوہِ قاف کی ساری مخلوق قربان نہ ہو جائے تو سہی——"

آپی نے تنک کر کہا۔ "اوئے پپوٹوں کے بچے! ہمارے سامنے غلط محاورے استعمال کرتا ہے! ہم—— ہم ہم——" اور پھر آپی خود ہی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

انجم بھائی نے اپنی تکیہ بنی ہوئی ران زور سے ہلا کر کہا۔ "گورو جی پنسیری تو اٹھاؤ۔"

اور گورو جی نے ہنس کر کہا۔ "اٹھاتے ہیں برخوردار، گھبراتے کیوں ہو؟"

برخوردار نے کہا۔ "سرکار ذرا جلدی کیجیے، ٹانگ سو گئی ہے اگر——"

آپی نے ٹوک کر کہا۔ "سونے دو، سوتوں کو جگانا بڑا پاپ ہے۔"

انجم بھائی نے سر جھکا کر بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ "آلا جی کیا کہتی تھیں طلّو؟"

"کچھ بھی نہیں۔" آپی نے کہا۔

"کچھ بھی نہیں کا کیا مطلب؟" انجم بھائی نے کہا۔ "کچھ تو کہتی ہوں گی۔"

"تایا ابا کی بابت کہہ رہی تھیں انجی۔ کہتی تھیں وہ بڑے سنگدل ہیں۔ ہمارے ساتھ تو بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ ایسی بڑی بات کے لیے خود کیونکر پیش قدمی کریں گے؟"

انجم بھائی سوچ میں پڑ گئے تو آپی اُٹھ کے بیٹھ گئیں اور ان کی ٹھوڑی اوپر اٹھا کر کہنے لگیں۔

وگدی اے راوی ماہی وے وچ اک پُھل کائی دا ڈھولا
مَیں نہ جمدی ماہی وے تو کی کر دیائی دا ڈھولا؟

انجم بھائی نے پتہ نہیں کیا کہنے کے لیے منہ کھولا تو آپی نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ "نہ نہ میں اگلا بول نہ سنوں گی—— بس!"

بھائی نے اپنی جیب سے ایک خط نکالا اور آپی کی طرف بڑھا دیا۔ آپی ہر سطر پڑھنے کے بعد انجم بھائی کے چہرے کی طرف دیکھتیں پھر آگے پڑھنے لگتیں۔ ان کی آنکھوں کا چانن ان کے سامنے تھا اور دودھیا کٹوروں میں تیل کے دھبے پھیلتے جا رہے تھے۔ دئیوں کی جوت کم ہوتی جا رہی تھی اور چنگاریاں بھوبل کی تہوں تلے دبی جاتی تھیں۔ پتہ نہیں وہ کس کا خط تھا۔ انجم بھائی کا یا ان کے ابا کا جس کسی کا بھی تھا، اس نے آپی کے وجود سے سارے گیت چاٹ لیے۔ ان کی آواز سے کوملتا نوچ لی اور آپی جیسے کالج کی آپی بن کر رہ گئیں۔

اس کے بعد ہماری مجلس کی ایک اور میٹنگ ہوئی اور یہ آخری نشست تھی۔ مجلس کو انجم بھائی اور آپی کے کہنے کے مطابق ختم کر دیا گیا۔ اس آخری نشست کی صدارت آلا جی نے کی۔ اس میں آپی نے ایک افسانہ "چانن اکھیاں دا" پڑھا۔ یہ بڑی

کرب ناک کہانی تھی۔ ایک ایک فقرے پر خار چھوڑ کٹار کا زخم لگتا تھا۔ اس پر پڑھنے
والے کی آواز لالاماموں جیسا آدمی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اختتام پر آلا جی نے
کسی کو بحث کی اجازت نہ دی۔ انہوں نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے بڑے دھیمے انداز میں کہنا
شروع کیا۔ "مجھے تم لوگوں کی اس مجلس میں کئی بار شرکت کرنے کا موقع ملا ہے اور ہر
مرتبہ میں دل میں دکھ لے کر یہاں سے گئی ہوں۔ آپ کے افسانوں میں خاص طور پر
طلعت کی کہانیوں میں درد اور مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ آپ کی نظموں میں
ناکامی اور تنگ دامانی کے سوا اور کسی چیز کی جھلک نظر نہیں آتی۔ اس دنیا میں پہلے کیا کم
دکھ ہیں جو تم لوگ کرب ناک کہانیاں اور درد انگیز قصے لکھ کر ان میں مزید اضافہ کرتے
رہتے ہو۔ ایسی باتیں کرنے سے حوصلے پست ہو جاتے ہیں، جی چھوٹ جاتے ہیں اور
عمل کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ آپ نوجوان ہیں، خدا نے آپ کو اپنا مستقبل
سنوارنے کے لیے بڑی طاقت دی ہے۔ اسے کام میں لائیے۔ تقدیر آپ سے قوی تر
ہے۔ مقدر کا لکھا ان مٹ نہیں ہوتا۔ تقدیریں بدلی جاتی رہی ہیں اور بدلی جاتی رہیں
گی۔ ہمیں بشاشت کی ضرورت ہے۔ صحت مندانہ پیش قدمی کی حاجت ہے اور
کھلاڑیوں جیسی روح کی احتیاج ہے۔ آپ لوگ نوجوان ہیں، صحت مند ہیں۔ اپنے
اپنے شانوں پر سوچنے سمجھنے والا سر رکھتے ہیں۔ پھر آپ دکھوں کی اندھی گھپاؤں میں
جھانک جھانک کر کیوں دیکھتے ہیں۔ خوشنما کلیوں کی باتیں کیجیے۔ چاند کی کرنوں سے گیت
مرتب کیجیے۔ افقی ستارے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیے۔ ان خوشبوؤں سے دامن
بسائیے جو اُجلے پھولوں سے پاکیزگی اور تبسم لے کر آتی ہیں اور اگر ایسا نہ ہوگا تو زندگی
بے حد تلخ فرض ہو کے رہ جائے گی اور مستقبل حال بننے سے پہلے آسیب زدہ خرابہ نظر
آئے گا۔"

شاید وہ ابھی کچھ اور کہتیں لیکن انجم بھائی نے انہیں بیچ ہی میں ٹوک دیا اور
کہنے لگے۔ "آلا جی ٹھیک کہتی ہیں۔ ہم ہی تو ہیں جو دکھوں کے جٹائل ناریل کو توڑ کر
اس میں سے جان بخش پانی حاصل کرتے ہیں۔ وہ ہمیں تو ہیں جنہوں نے زندگی کو
دلآویز بنانے کے لیے سمندر پھاڑ ڈالے۔ پہاڑوں سے دریا بہائے اور خارزار وادیوں کو
تختۂ گل بنا دیا۔ مجھے چاند سے عشق ہے۔ ان پھولوں سے عشق ہے جو چاندنی میں کھلتے

ہیں اور ان خوشبوؤں کا سودا ہے جو ہمیں زندگی کا احساس دلاتی ہیں۔۔۔"

آلا جی نے ہولے سے کہا۔ "صاحبِ افسانہ کو اپنی کہانی موضوع یا نظریے
کی وضاحت کے لیے کچھ کہنا ہے؟"

آپی نے دوپٹہ سنبھالتے ہوئے کہا۔ "اگر میرے شانوں پر واقعی سوچنے
سمجھنے والا سر ہے تو مجھے کچھ نہیں کہنا۔"

محفل درہم ہو گئی اور میں اپنی کاپی لے کر آخری کارروائی لکھنے کے لیے بیٹھ
گئی تو آپی نے انجم بھائی کا کوٹ پکڑ کر کہا۔ "جو کچھ تم کہہ رہے تھے، کیا واقعی اس سے
تمہارا مطلب بھی یہی تھا؟"

"بالکل۔" انجم بھیا نے اعتماد سے کہا۔ پھر وہ ذرا رک کے اور پیار بھرے لہجے میں
کہنے لگے۔ "آخر ہم کیوں نہ پھولوں، خوشبوؤں اور کرنوں کی باتیں کریں۔ کیوں نہ
خوشگوار مستقبل کے تذکرے کریں۔"

آپی نے کہا۔ "ہم کیوں نہ سچی باتیں کریں، کیوں نہ وہی کریں جو ہوتا ہے۔ جو
ہونے والا ہے اور جو ہوا تھا۔"

انجم بھائی نے کہا۔ "اچھی اچھی باتیں سوچنے سے اچھے اچھے کام آپ سے
آپ ہو جایا کرتے ہیں۔" پھر انہوں نے آپی کا کندھا تھپتھپا کر کہا۔ "تم نہیں جانتیں
طلّو، مجھے کلیوں اور کرنوں سے کتنا پیار ہے۔ اتنا پیار شاید مجھے تم سے بھی نہ ہو۔" پھر
انہوں نے میری طرف دیکھا اور آپی کے کندھے پر ہاتھ رکھے رکھے انہیں باہر لے
گئے۔

تمبا کو انسپکٹری تو خیر تفریحی نوکری تھی۔ اسے چھوڑ چھاڑ کر انجم بھائی نے
فوج میں کمیشن لے لیا۔ اس کی خبر نہ ہم کو ملی، نہ ان کے گھر والوں کو پورے پندرہ بیس
دن بعد ملٹری اکیڈمی سے ان کا خط آپی کے نام آیا تو پتہ چلا کہ صاحبزادے کے بڑے
ٹاٹھ ہیں۔ ٹریننگ کے بعد ابھی لیفٹیننٹ کے عہدے پر ہیں۔ کسی چھاؤنی میں تھے کہ
آفیسروں سے کہہ سن کر برما فرنٹ پر جانے کا حکم حاصل کر لیا۔ اس کا علم میرے اور
آپی کے سوا کسی اور کو نہ تھا جس دن ہمارے شہر سے گزرتا تھا، میں اور آپی اسٹیشن پر
گئیں۔ وردی پہنے، ٹیڑھی سی ٹوپی رکھے۔ اپنے ڈبے کے باہر کھڑے سگریٹ پی رہے

تھے۔ مجھے اپنے ساتھ یوں لپٹا لیا جیسے میں ان سے پنسل ترشوانے آئی تھی۔ ہنس کر کہنے لگے "ذرا طلّو کا منہ تو دیکھو، ایسی وہمی لڑکی میں نے اپنی زندگی میں کوئی نہیں دیکھی۔ ایسی کھڑی ہے گویا میرا جنازہ اٹھنے والا ہے۔"

مَیں نے جل کر کہا۔ "یہ کیا بکواس ہے۔ اکیڈیمی میں ایسی ہی باتیں سکھائی جاتی ہیں کیا؟" "اس سے بھی بڑھ کر۔" وہ پھر ہنسے اور مَیں خاموش ہو گئی۔

انجم بھائی نے آپی کے کندھے پر ہولے سے ہاتھ رکھا اور چمکار کر کہنے لگے۔

"میں نے ہمت کبھی نہیں ہاری اور میں چاہتا ہوں، میرے دوست بھی اعتماد کرنا سیکھیں۔ اگر تمہیں مجھ پر اور اپنے آپ پر اعتماد ہے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جب میں تمبا کو انسپکٹر تھا تو ذرا سا کمزور تھا لیکن اب میں فولاد کی طرح مضبوط ہو گیا ہوں اور مجھے یوں لگتا ہے کہ زندگی اور موت دونوں میرے قبضے میں آ گئی ہیں۔ فرنٹ پر پہنچتے ہی میں ابا کو لکھوں گا۔ پھر دیکھوں گا، وہ کیسے انکار کرتے ہیں۔" آپا کی آنکھیں ذرا دیر کے لیے چمکیں اور پھر وہ پلیٹ فارم پر نگاہیں گاڑ کر کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گئیں۔

گاڑی چلنے لگی تو انجم بھیّا نے کہا۔ "طلّو دامن کیسا ہی کیوں نہ ہو، انہیں کلیوں سے سجانا تمہارا کام ہے۔ مقدر (اگر کوئی چیز مقدر ہے تو) کیسا بھی تاریک کیوں نہ ہو، ہمت عالی سے منور کیا جا سکتا ہے۔ چاند نکلتا ہے تو اس کی کرنیں بلا قیمت میسر آتی ہیں لیکن انہیں مہیا کرنا اور سنہرا مستقبل وضع کرنا ہمارا اپنا کام ہے۔"

گاڑی چلنے لگی، وہ پائدان پر کھڑے ہو کر آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے "تمہیں حاصل کرنے کے لیے میرے جو قدم اٹھیں گے، مجھے ان پر پورا بھروسہ ہے۔ میں ایک دن تمہیں لینے کے لیے آؤں گا۔ خواہ میری راہ میں جہنم ہی کیوں نہ حائل ہو جائے۔"

گاڑی تیز ہوتی جا رہی تھی اور ہماری رفتار سست ہو رہی تھی۔ انجم بھیا کا قوی ہاتھ فضا میں لہرا رہا تھا اور میں ویسے ہی تیزی کے ساتھ اپنا بازو ہلا ہلا کر جواب دیئے جاتی تھی۔ آپی انجن کی طرف پیٹھ موڑے اسٹیشن کی چھت کو گھور رہی تھیں۔ جب ہم اسٹیشن سے باہر نکلنے لگیں تو آپا نے آہستہ سے کہا۔ "نثرو تجھے بھی انجی اچھا لگتا ہے؟"

"اچھا۔" مَیں آپی کے ساتھ لپٹ گئی۔ "انہی کی وجہ سے تو تم مجھے اتنی پیاری لگتی ہو۔"

انجم بھائی کے اباجی کی پنشن ہو گئی اور وہ چند دنوں کے لیے ہمارے یہاں آئے۔ ڈیڈی سے کچھ باتیں ہوتی رہیں اور پھر انہوں نے تجارت شروع کر دی۔ ڈیڈی کی کوششوں سے انہیں ایک بنگلہ بھی مل گیا اور ان کا سارا کنبہ یہیں آ گیا۔ آلا جی ڈیڈی کے ساتھ کبھی کبھار ان کے یہاں جاتیں۔ پرانی تلخیاں معدوم ہو گئیں اور دونوں گھرانوں کے تعلقات کسی حد تک اچھے ہو گئے۔ اس اثناء میں انجم بھائی نے اپنے ابا کو ضرور لکھا ہو گا۔ پہلے تو تایا جی نے لوگوں کے ذریعے آپی کے رشتے کا یونہی سا اظہار کیا لیکن ایک دن تائی جی کو ساتھ لے کر خود آ پہنچے اور آپی کے رشتے کی درخواست کی، منگنی ہو گئی۔ آلا جی اس تقریب پر اس قدر خوش تھیں کہ میں نے اس سے پہلے انہیں کبھی ایسا نہ دیکھا تھا۔ معمولی رسوم کی ادائیگی کے بعد میں نے آپی کو بازوؤں میں لے کر کہا۔ "دیکھا آپی ایسے ہیں انجم بھیا، تم خوامخواہ اپنے نظریات لیے پھرتی تھیں۔ آخر تم ہار گئیں نا۔"

آپی نے مسکرا کر کہا۔ "میں کیا ہار گئی، ہار گئے تو نظریات ہار گئے۔"

مَیں نے چمک کر کہا۔ "بھلا آپ سے کس نے کہا تھا کہ ہارنے والے نظریات کو اپنائیں۔"

اس پر آپی خاموش ہو گئیں۔

دو سال کا عرصہ پلک جھپکنے میں بیت گیا۔ انجم بھائی ہر ہفتے باقاعدگی سے خط لکھتے اور آپی ان کا جواب دیتی رہیں۔ آخر بڑی کوششوں اور سفارشوں کے بعد بھائی کو چھٹی ملی اور وہ یہاں آنے کے لیے روانہ ہوئے۔ آپی کے دل میں خوشی کے کیسے کیسے سمندر ٹھاٹھیں مار رہے تھے۔ اس کی کیفیت ان کے چہرے سے عیاں تھی لیکن آپا بھی ایک ہی کمینی تھیں، کبھی زبان سے اظہار نہ کیا۔ میں نے ان کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ان سے وہ تمام چشم دید واقعات بیان کیے جو میں نے چھپ چھپا کر دیکھے تھے اور جس کا علم نہ آپی کو تھا، نہ انجم بھائی کو لیکن آپی اپنے دل کی بات کبھی زبان پر نہ لائیں۔

جس صبح انجم بھائی کو یہاں پہنچنا تھا، اس سے ایک دن قبل آپی ایسی صُمٌّ بُکمٌ ہوئیں گویا انہیں معلوم ہی نہیں، کون آ رہا ہے۔ کب آ رہا ہے اور کس سے ملنے آ رہا ہے!

مجھے آپی کے اس بلی پنے پر بڑا غصہ آیا لیکن کر کچھ نہ سکی۔ بس بھائی کا انتظار کرتی رہی اور سارے شکوے ان کی آمد پر اٹھا رکھے۔

جس صبح انہیں یہاں آنا تھا، آپی کے سوا ہم دونوں گھرانوں کے افراد انہیں لینے کے لیے اسٹیشن پر گئے۔ گاڑی آئی لیکن اس میں انجم بھائی نہیں تھے۔ ہم سب مایوس ہو کر اپنے گھروں کو لوٹے۔ آپی نے مجھ سے ایک دم بہت سے سوالات کر ڈالے لیکن میں نے ایک کا بھی جواب نہ دیا اور ان سے بر تر بلی بن کر تکیہ میں منہ چھپا کر لیٹی رہی۔ اسی شام خون سے لت پت انجم بھائی کی لاش ان کے گھر پہنچ گئی۔ تایا جی کا نوکر ہمیں اطلاع کرنے آیا تھا تو اس نے کہا کہ انجم بھائی ایک دن دلی میں اپنے کسی دوست کے ہاں مقیم رہے۔ دونوں نے موٹر سائیکل پر یہاں پہنچنے کی سکیم تیار کر لی۔ اسباب گاڑی میں بک کرا دیا تھا اور وہ دونوں ادھر آنے کے لیے موٹر سائیکل پر روانہ ہو گئے۔ یہاں سے چند میل پرے جرنیلی سڑک پر ان کی موٹر سائیکل اینٹوں سے بھرے ہوئے ایک ٹرک کی لپیٹ میں آ گئی۔ انجم بھائی کا دوست تو بچ گیا لیکن وہ خود جانبر نہ ہو سکے اور سڑک کے کنارے ہی دم دیا۔

یہ خبر سُن کر آلا جی چیخیں مار مار کر رونے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد سوائے ہم دونوں کے بنگلے کا ہر فرد حتیٰ کہ نوکر اور چوکیدار بھی تایا جی کے یہاں پہنچ گئے۔ میں آپی کے پاؤں میں بیٹھی خاموشی سے آنسو بہاتی جاتی تھی۔ آپی بڑے ہی حسین مجسمہ کی طرح کرسی میں بیٹھی تھیں۔ کبھی کبھی میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتیں۔ پھر دیوار کو گھورنے لگتیں۔

کافی رات گزر گئی۔ چاند نکلا۔ آپی آہستہ سے اٹھیں اور میری کلائی پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولیں۔ "چلو پھول چُنیں۔ انجی کو کلیوں اور کرنوں سے بڑا پیار تھا۔ اسے یہ دونوں چیزیں اتنی اچھی لگتی تھیں کہ کبھی کبھی وہ ان کے شوق میں دیوانہ سا ہو جاتا تھا۔ پر میں نے اس کے کمرے میں نہ تو کبھی کلیوں کا ڈھیر دیکھا تھا اور نہ کرنوں کی آمد و رفت کے لیے کوئی دریچہ۔ انجی آ جاتا تو ہم تینوں مل کر کلیاں چننے جاتے لیکن وہ نہیں آ سکا تو ہم دونوں ہی یہ کام کریں گی۔" آپی بے خیالی میں پتہ نہیں کیا کچھ کہے جاتی تھیں۔ پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ریڈنگ روم سے دونوں ٹوکریاں اٹھا لائیں اور ہم

دونوں باغیچے میں نکل کر کلیاں چننے لگیں۔

بالکل ایسی ہی چاند رات کو انہی پیڑوں میں سے میں نے کتنی ہی کلیاں توڑی تھیں۔ ساری رات آپی کے ساتھ بیٹھ بیٹھ کر لمبی لمبی لڑیاں گوندھی تھیں۔ بار بار اٹھ کر ان پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیے تھے اور پھر ان لڑیوں کو ایک ساتھ ٹانک کر کتنی ہی لمبی چوڑی چادر تیار کر کے بڑے سلیقے سے ٹوکری میں بند کیا تھا۔ اگلے دن صبح ہی صبح میں اور آپی چوکیدار کے ساتھ قبرستان گئیں اور ہم دونوں نے کلیوں کی وہ چادر جو چاندنی کی کرنوں تلے بیٹھ کر گوندھی تھی، انجم بھائی کی قبر پر ڈال دی۔ آپی ایسی کٹھور تھیں کہ انہیں بھائی کی قبر دیکھ کر بھی رونا نہ آیا۔ مجھے اپنے ساتھ چمٹا کر یہ ہی کہتی رہیں۔ "تجھے پنسلیں ہی ترشوانی ہیں نا، میں تراش دیا کروں گی۔ ویسی ہی صفائی سے، ویسی ہی نفاست کے ساتھ!"

اس وقت کیسی اجلی چاندنی پھیلی ہے، کتنے پیارے پھول ہیں اور کیسا لہکتا مہکتا گیت ہے کہ ابابیل کی طرح اوپر ہی اوپر جاتا ہے۔ یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ اس وقت میں اکیلی ہی پھول چننے کے لیے آئی ہوں اور جب ٹوکری بھر کر اندر لوٹوں گی تو اکیلے ہی بیٹھ کر انہیں گوندھوں گی۔ کل جب آپی کی برات آئے گی اور دولہا بھیا کو اندر بلایا جائے گا تو میں خوشبوؤں کے تاجر کے گلے میں ڈھیر سارے پھولوں کے ہار ڈال کر کہوں گی۔ "مصنوعی خوشبوئیں امپورٹ کرنے والے بھیّا، ذرا ان کی نکہت بھی دیکھو——" لیکن پتہ نہیں آج ان کلیوں کی خوشبو اور رنگ مصنوعی سا ہو کر کیوں رہ گیا۔ جیسے انہیں پٹرول میں نکھارا گیا ہو۔

اندر نوکرانیاں ڈھولک پر گیت گا رہی ہیں۔

وگدی اے راوی ماہی وے وچ اک پھل کائی دا ڈھولا
مَیں نہ جم دی ماہی وے توں کی کرویائی دا ڈھولا

اور ڈھولک ایسے بج رہی ہے جیسے دور بہت دور سنسان سڑکوں پر کوئی ہولے ہولے موٹر سائیکل پر گھوم رہا ہو۔

☆-------------☆

برکھا

جب وقت ایسا آگیا کہ فیل پا سے دھوپ کا چتاخ اُچک کر کونے میں ایستادہ حقّے کی چلم پر ٹِک گیا تو ثریا نے آنکھیں کھول دیں۔ مسلسل کئی گھنٹوں سے وہ قالین پر بے ہوش سوتی رہی تھی اور اب جب دھوپ کے چتاخ نے اس کے پاؤں میں تتیا مرچیں بھر دی تھیں اور وہ جاگنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ کھانا کھانے اور آم چوسنے کے بعد جب وہ قالین پر آکر لیٹی تھی تو تیز دھوپ کا یہ دھبیلے والا پتنگ ڈسک کے نیچے پڑا تھا مگر ثریا اس کی طرف دھیان دیئے بغیر تکیہ دہرا کر کے فیل پا پر لیٹ گئی تھی۔ میٹھے میٹھے آموں کے گاڑھے گاڑھے بوجھل رس نے جب اس کی آنکھوں میں نیند کی جادو بھری سلائیاں پھیر دیں تو یہ پتنگ (تکّل) ڈسک تلے سے پھسل کر اس کی ران سے جا چمٹی تھی۔ نیند کی حالت میں صوفے کی طرف کروٹ بدل کر ثریا نے اس ورق کو پھر قالین پر چھوڑ دیا تھا اور خود خوابوں کی وادیوں میں تیرتی چلی گئی تھی۔ برآمدے کے کلاک نے کچھ بجایا تو یہ آفتابی پتنگ بھی سرکاری لفافہ سا بن کر قالین پر ثریا کی طرف اور رینگ گیا۔ اس نے سوتے میں جھلّا کر دونوں ٹانگیں اٹھا کر صوفے پر ڈال دیں تو لفافہ ڈاٹ کے نیچے پڑا رہ گیا۔ نیند میں خدا جانے کب اور کیسے اس کا پاؤں گدے سے اُٹھ کر صوفے کے بازو پر چلا گیا جو کرنوں سے اس ریگمال کی پکڑ میں آگیا۔ ثریا کی نیند تو کھل گئی مگر اس نے پاؤں وہاں سے اٹھایا نہیں۔ ویسے ہی لیٹے لیٹے جعفری کی طرف دیکھا اور مانو بلی کی سی ایک جمائی لی۔ بنیائن کی ڈوری کندھے سے پھسل کر عین وہاں آٹکی تھی جہاں درمیانی کا نشان ہوتا ہے۔ اس کا کلیجہ گویا منہ کو آرہا تھا اور اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ یونہی لیٹے لیٹے ثریا نے ایک مرتبہ پھر جعفری کی طرف دیکھا۔ اس کی کھڑکی کے نچلے چوکھٹے پر

انگریزی میں کا کالیا چھپا تھا۔ بڑھئی نے کھوکھے کی لکڑی بغیر رندہ کیے یہاں لگا دی تھی اور سبز روغن کے باوجود یہ لفظ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ثریا نے سوچا کہ کسی شہر کا نام ہو، کچھ بھی ہو اس نے جی ہی جی میں کہا۔ عجیب سا نام ہے جیسے کسی نے گود میں بچّہ اٹھا لیا ہو— کا کالیا اور پھر وہ خود ہی اپنی اس فضول سی بات پر مسکرا پڑی۔ ٹین کی لہریا چھت پر نظریں گاڑے اس نے ایک مرتبہ پھر اٹھنے کی کوشش کی مگر میٹھے آموں کا سوم رس ریشہ ریشہ میں عجیب امرت گھول رہا تھا۔ نیند غائب تھی مگر آنکھیں مچی جا رہی تھیں۔

یوں تو ہر امتحان دے چکنے کے بعد آدمی کے سر سے ایک ایسا بوجھ سا اُتر جاتا ہے کہ سوائے کھانے اور سونے کے کوئی مقصد ہی نہیں رہتا مگر میٹرک کا آخری پرچہ ختم کر چکنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ آج سے مستقبل محفوظ ہوا اور زندگی کے آخری سانس تک کی پنشن پکی ہوگئی۔ وہ صاحبزادے جو دس پندرہ دن پہلے میلے کچیلے دستر خوان میں ٹکے ٹکے کی برف لینے بھیجے جاتے تھے، ایک دم معزّز سے ہو کر منہ پر انگریزی اخبار ڈالے پنکھوں تلے دوپہریں گزارتے ہیں۔ کہنا سننا تو ایک طرف سب گھر والوں کی دُمیں ہوتیں تو ان کے گرد حلقہ باندھ کر یوں ہلاتے گویا کہہ رہے ہوں کاش ہمارے عاجزی وانکساری اور محبت و شفقت کے اظہار کا کوئی اور لطیف ذریعہ بھی ہوتا۔ لڑکیوں کا درجہ اور بھی اونچا ہے کیونکہ دسویں کے بعد لڑکی کی ایک واضح صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لیے ایک صحیح الدّماغ اور نارمل انسان میٹرک لڑکی کو ان پڑھ گریجوایٹ صاحبزادی پر ترجیح دیتا ہے۔ دسویں پاس لڑکی میں کچھ ان امرودوں کی سی گدری گدری خوشبو ہوتی ہے جنہیں باغباں ڈالی سے توڑ کر پتوں کے بستر پر رکھے جاتا ہو۔ یوں تو سگندھ ہر امرود میں ہوتی ہے مگر جب چھپے والا قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتا ہے کہ جناب یہ توٹوکرے کی داب ہے تو رہی سہی گدراہٹ بھی معدوم ہو جاتی ہے۔ واضح شکل سے یہاں مراد کوئی شخصیت، فردیت وغیرہ نہیں۔ بس واضح سی شکل ہی ہے جس کا اقلیدس یا مسطحات سے کوئی تعلق نہیں۔ زیریں منزل پر پانی کا نل ہوتا ہے نا بس کچھ ایسے ہی سمجھیے۔ دھار نکلتے ہی بالٹی کے تنے ہوئے جستی پیندے پر ایسا نقارہ بجتا ہے۔ گویا افطاری کی صلا ہو۔ ویسے تو پانی بالائی منزل پر بھی پہنچتا ہے مگر باریک سی تُلتُلی کے

آگے آستین چڑھا کر بیٹھے رہنے سے تیمم بہتر! ثریا کو دسویں کا امتحان دیئے کوئی ایک مہینہ گزر چکا تھا اور اب وہ نتیجہ کا انتظار کر رہی تھی۔ اس اثناء میں اسے فرمائشی پروگرام سننے، جی بھر کے سونے اور فلمی رسالے پڑھنے کے علاوہ صبح و شام باقاعدگی سے دودھ بھی پینا ہوتا تھا کیونکہ اس کی امی کے نزدیک رنگت نکھارنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ امینہ کا گھر گو اس کے یہاں سے پانچ سات میل دور تھا، اس پر بھی ثریا کو ہر روز اپنی سہیلی سے ملنے کی کھلی اجازت مل چکی تھی۔ یہ بات الگ تھی کہ وہ اپنی سستی کی بدولت امینہ سے ہفتہ میں ایک بار بھی مل نہ پاتی۔ پہلے دن کمرۂ امتحان کو جاتے ہوئے اس نے امی سے جو ان کی گھڑی لی تھی تو آج تک لوٹانے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ سہیلیوں کو خط لکھنے اور معمے بھرنے کو اباجی نے اپنا پارکر جونیئر خود اسے بخش دیا تھا۔ پہلے کاپی بھی امی سے پوچھ کر منگوائی جاتی۔ اب مہینے میں چپ چاپ ہاکر سے دو تین فلمی پرچے بھی لے لیتی تو اباجی اخبار کے ساتھ آپ سے آپ بل ادا کر دیتے۔ بھائی جان پہلے ہی اس پر مہربان تھے اور مانی سے جھگڑا کرنے کو اب خود اس کا جی نہ مانتا تھا۔

جو دوپہر اس نے فیل پا پر سرسوں کی کھلی گونی کی طرح سوسو کے گزار دی تھی، اسی دوپہر چلچلاتی دھوپ میں لطیف صاحب کے کوارٹر پر ایک تانگہ آ کے رکا تھا اور ایک بڑا سا کالا ٹرنک اور مچھلی پکڑنے کی لمبی سی ولائتی بنسی چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ اگر وہ کوئی کہانی پڑھ رہی ہوتی یا معمہ حل کرنے میں مصروف ہوتی یا کم از کم شدید گرمی نے اس پر صرف غنودگی ہی طاری کی ہوتی تو وہ فیل پا سے اٹھ کر جعفری کے کمرے میں سے ضرور اس تانگے کو دیکھتی کیونکہ پڑوسیوں کے مہمان اپنے مہمانوں سے کہیں دلچسپ ہوتے ہیں مگر ثریا اٹھ نہ سکی۔ کنچن کرن کا روپ دھار کر سونے والی کو پتہ بھی نہ چلا کہ کون آیا اور کون گیا۔ شام کو جب کھانے کی میز پر اباجی نے بتایا کہ لطیف صاحب کا بھانجا امتحان دے کر چند مہینوں کے لیے ماموں کے پاس آیا ہے تو ثریا کو یاد آیا کہ واقعی امتحان دینے کے فوراً بعد لوگ اپنے رشتہ داروں کے یہاں جا کر کئی کئی مہینے گزارا کرتے تھے اور خوب مزے سے وقت بتایا کرتے ہیں۔ اس رات وہ بڑی دیر تک کروٹیں بدلتی رہی۔ یہ نیند خدانخواستہ مہمان کی آمد پر اچاٹ نہ ہوئی تھی بلکہ کچھ حبس کی وجہ سے اور کچھ دوپہر کو زیادہ سو لینے کے سبب حرام سی ہو رہی تھی۔ اپنے مہمان نواز

رشتہ داروں اور فیاض عزیزوں کا تصور باندھے ہوئے کوئی ساڑھے بارہ بجے کے قریب ثریا پھر میٹھی نیند سو گئی۔

بڑے کمرے میں چھت کا پنکھا پوری رفتار پر چھوڑ کر امینہ نے ثریا کو گردن سے پکڑ لیا اور جھٹکے دیتے ہوئے بولی۔ ”سچ مچ بتا کمینی ورنہ میں تجھے جان سے مار دوں گی۔“

ثریا اس کی دونوں کلائیاں پکڑ کر کچھ شرارت کچھ خجالت سے ہنسنے لگی اور اسے پرے دھکیلتے ہوئے بولی۔ ”چھوڑ تو سہی یہ تیرے بلّی کے پنجے میرا خون کیے دیتے ہیں۔“ اس خفیف سی ہاتھا پائی میں دونوں مسکراتی ہوئیں بڑے صوفے میں گر گئیں۔ قریب ہی چھوٹی تپائی سے لیٹر او پنر ثریا کا زانو لگنے سے قالین پر گر گیا۔ اسے اٹھاتے ہوئے ثریا نے پوچھا۔ ”اچھا تو نے وہ ہوم ٹاسک ختم کر لیا؟“ تو امینہ نے شکوہ آمیز لہجہ میں جواب دیا۔ ”میں کیا کروں۔ ڈیڈی اپنی الماری کو تالا لگا کے رکھتے ہیں اور پھر گرمی اتنی ہوتی ہے کہ کسی کام کو جی نہیں چاہتا۔“

ثریا نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ ”چلو جی ہمیں کیا تمہیں ہی گناہ ہو گا۔“ اور پھر لیٹر او پنر تپائی پر پڑی ہوئی ایک موٹی سی کتاب میں دبا دیا۔

امینہ نے زمین پر جھک کر اپنی چپلی کے بکل کھولتے ہوئے پوچھا۔ ”سچ سچ بتا ثریا تیرے دل میں کیا ہے۔ تجھے میری قسم جو جھوٹ بولے۔ آخر اتنے دن آئی کیوں نہیں؟“

”بس یونہی۔“ ثریا نے گریبان میں پھونک مار کر جواب دیا۔

”اتنے دن گھر پر ہی رہی؟“

”اور کہاں جاتی؟“

”پھر یہاں کیوں نہ آئی؟“

”بس آ ہی نہ سکی۔ پھر تو ہمارے یہاں کون سے روز کے پھیرے ڈالتی ہے۔“

”دیکھا ناوہی بات۔“ امینہ نے آنکھیں گھما کر کہا۔ ”پہلے تین چار دن تو آ ہی نہ سکتی تھی۔ اس کے بعد ڈیڈی کے چیف کنٹرولر آ گئے اور مجھے پانچ منٹ کے لیے بھی کار نہ مل سکی۔ اسی لیے تو میں نے مالی کو رقعہ دے کر بھیجا تھا۔“

"تو بس پہ آجاتی، وہاں کس نے تیری راہ——"

"مجھے تو ان کمبخت بسوں کے نمبروں کا ہی پتہ نہیں چلتا۔" امینہ نے بات کاٹی۔ "تیرے گھر آنے کو تین چار مرتبہ بدلنی پڑتی ہیں۔ کسی سے پوچھو تو کوئی کچھ بتاتا ہے کوئی کچھ۔ میں کیسے آتی ثریا؟"

ثریا اسے بڑا ہی سخت جواب دینے لگی تھی کہ امینہ کے ڈیڈی اندر آ گئے۔ پنکھے کے ریگولیٹر سے نگاہیں اٹھاتے ہی انہوں نے ثریا کو دیکھا تو دور سے پکارے۔ "کہو بھئی ثریا، کچھ تمہارے رزلٹ کا پتہ چلا؟"

"جی ابھی تو نہیں۔" ثریا نے سمٹ کر جواب دیا۔

"پھر بھی کتنے نمبر آ جائیں گے؟"

"جی یہی سیکنڈ ڈویژن بن جائے گی بس۔"

"اور کیا چاہیے۔" انہوں نے ہنسنے کی کوشش کی اور مسکرا کے رہ گئے۔

امینہ نے اپنی چوٹی کھولتے ہوئے چپلیاں پاؤں سے پرے دھکیل دیں اور پنکھے کے نیچے سرو قد ایستادہ اپنے ڈیڈی سے پوچھا۔ "ڈیڈی آپ کے کنٹرولر کب جائیں گے؟"

"کل شام بیٹا!"

"پھر پرسوں ہم پک نک پہ چلیں گے۔" امینہ نے الٹی میٹم دیا۔

"اس گرمی میں؟" ڈیڈی نے گریبان کے بٹن کھولتے ہوئے کہا۔ "کوئی چھینٹا پڑے تو مزا آئے۔ ایسی گرمی میں تو اپنا ہی بھرتہ ہو جائے گا۔"

"نہیں ڈیڈی ہم ضرور جائیں گے۔" امینہ ضد کرنے لگی۔

"اسے سمجھاؤ ثریا۔ بھلا یہ موسم کوئی پک نک پہ جانے کا ہے۔" ڈیڈی آنکھوں ہی آنکھوں میں گویا توبہ توبہ پکارنے لگے۔ ثریا مسکرانے لگی تو امینہ روٹھی ہو کر بولی۔

"بارش تو سارا سال نہیں ہوگی، ہم کیا پک نک پہ نہیں جائیں گے؟"

گریبان کے بٹن بند کرتے ہوئے ڈیڈی نے اطمینان سے کہا۔ "دعا کرو دعا۔ دعا میں بڑی برکت ہے۔" پھر کرسی سے اپنا اوور کوٹ اٹھایا اور باہر نکل گئے۔

"ڈیڈی کے بچے۔" امینہ نے جھوٹ موٹ غصے سے شلوار کے پائنچے اوپر

کھینچتے ہوئے کہا۔ "گرمی کی بچی۔"

کھانا کھا چکنے کے بعد جب دونوں سہیلیاں امینہ کے سونے والے کمرے میں ٹیبل فین کے سامنے آ بیٹھیں تو ثریا نے کہا۔ "لطیف صاحب تو ایسے گورے نہیں پر وہ اتنا سفید ہے جیسے روئی کا گالا۔ لڑکے اتنے گورے اچھے نہیں لگتے۔ نہیں لگتے ناں؟" اس نے امینہ سے تصدیق کرانی چاہی۔

امینہ نے منہ سکوڑ کر کہا۔ "لگتے بھی ہیں اور نہیں بھی۔ ہاں ذرا کم ہی اچھے لگتے ہیں پھر؟"

"پھر کیا؟" ثریا نے کہا۔ "سارا دن برآمدے میں پنکھا لگا کے کچھ لکھتا رہتا ہے۔ کبھی سگریٹ پینے لگتا ہے۔ کبھی ٹانگیں اٹھا کے میز پر ڈال لیتا ہے۔"

"کسی کو تو لیٹر لکھتا ہوگا۔" امینہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

"نہیں، ایسا نہیں۔" ثریا جلدی سے بولی۔ پھر خفیف ہو کر کہنے لگی۔ "ٹھیک ہے، یونہی ہوگا۔ ایسا ہی ہے امینہ۔ تو لیٹر ہی لکھتا ہے۔"

"کالے منہ والا۔" امینہ نے چڑ کر کہا۔ "بارہ روز سے میری سہیلی چھین رکھی ہے۔" اور اس نے سہیلی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"بڑا آیا چھیننے والا۔" ثریا نے بانہوں کے حلقے سے نکلتے ہوئے کہا۔ "اسے تو پتہ بھی نہیں کہ سولہ نمبر میں مَیں رہتی ہوں۔"

"سب پتہ ہے ثریا۔" امینہ نے وثوق سے کہا۔ "یہ لڑکے بڑے ہشیار ہوتے ہیں۔"

"پر وہ تو اُلّو سا ہے۔ اُلّو کی دم فاختہ۔" ثریا کا خیال تھا کہ امینہ بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو جائے گی مگر وہ خاموشی کے ساتھ اپنی چوٹی سے کھیلتی رہی۔

"یہ میٹھا برس بڑا خطرناک ہوتا ہے گوئیاں۔" امینہ نے بڑی بوڑھیوں کا سا انداز اختیار کر کے کہا۔ "ایک تیری سانولی سلونی کشش دوسرے اس سفید چوہے کی بے نیازیوں کے پھندے دونوں ایسی پھنکی میں پھنسو گے کہ مجھ ایسی سہیلیاں بارہ بارہ برس شکل دیکھنے کو ترس جائیں گی۔"

"دور دفان۔" ثریا نے بڑی ہمت سے کہا۔ "ایسی کونسی قیامت آئی جاتی ہے۔"

"اچھابی بی۔" امینہ نے ہاتھ پھیر کر کہا۔ "ٹھیک ہو گا۔"

اب کے گرمی نے کوئی آفت ڈھائی تھی کہ لوگوں نے آسمان کی طرف دیکھنا بھی ترک کر دیا تھا۔ دن بھر کڑاکے کی دھوپ پڑتی۔ سہ پہر کو لُو چلنے لگتی اور شام سے حبس کی باناتیں تن جاتیں۔ یوں لگتا تھا گویا سالہا سال سے اس زمین نے بارش کی بوند تک نہ دیکھی ہو۔ دفتروں کے اوقات میں آئے دن تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ کاروبار ماند پڑتا جا رہا تھا۔ جنس کے بھاؤ چڑھ رہے تھے اور لوگوں کے منہ اُترتے جا رہے تھے۔ سورج کے آتشیں تیروں نے ضروری سے ضروری کام کو گھائل کر دیا تھا اور خس خانوں میں بیٹھنے والے آج کے کام کو آنے والے اچھے دنوں پہ چھوڑ دیتے تھے۔ ثریا کے اباجی جب دفتر سے لوٹتے تو برآمدے کی سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہی ہر روز یہی کہتے۔
"اب کی بار جو گرمی پڑ رہی ہے، اس سے پہلے اپنی ساری عمر میں نہ دیکھی، نہ سنی۔ غضب خدا کا 117-118 ڈگری بھلا اس ملک میں کون جیئے گا۔" پھر وہ ہیٹ کھونٹی پر لٹکاتے ہوئے کہتے۔ "کہیں بارش کے آثار بھی تو دکھائی نہیں دیتے جو آدمی زندہ رہنے کی اُمید باندھ لے۔"

امّی کہتیں۔ "اور پنکھے کے نیچے بیٹھ کر اور جسم جلتا ہے۔ کہیں سے دو بوندیں پڑیں تو کپڑے ہی سی لوں۔ دو مہینوں سے قطع کیا ہوا گٹھڑ پڑا ہے۔"
مانی سکول سے آتے ہی دیوار کے ساتھ کمر کھجانے لگتا تو بھائی جان اپنے ننگے پیٹ پر دھپ دھپ ہاتھ مارتے ہوئے کہتے۔ "بیٹا یہ گرمی کے دانے ہیں، دیواروں سے رگڑے لگا کر نہیں مٹتے۔ بادلوں کی پھوار مانگتے ہیں۔ جس دن اپنے کوارٹر سے دس میل پرے بارش ہو گئی تیرا پنڈا مخمل سا نکل آئے گا۔" لیکن مانی یہاں تک کھجاتا کہ خون نکل آتا۔ گرمی ثریا کو بھی لگتی تھی اور دوہرے کپڑے پہننے سے جان اور بھی عذاب میں تھی، مگر اس کی دوپہر نیند کے غلبے میں کافی آسانی سے گزر جاتی۔

جب لطیف صاحب کے بھانجے کو گرمی بہت زیادہ ستانے لگتی تو وہ اپنے سفید پائنجامے کے پائینچے گھٹنوں تک چڑھا لیتا۔ تھوڑی دیر بعد قمیص بھی اتار دیتا اور پھر ڈور

بندھی پنگ پانگ کی گیند میز سے اٹھا کر فرش پر بجاتا۔ برآمدے کے کونے سے چتکبرا بلونگڑا بجلی کی طرح تڑپ کر گیند سے لپٹ جاتا اور سیمنٹ کے فرش پر کمر کے بل پھرکی سی گھومنے لگتا۔ اسی پھرتی میں جب بلونگڑا ڈوری کے بھلاوے اپنی دُم پکڑ لیتا تو لڑکے کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اس کے چہرے پر شنگرفی سی ہو کر پھیل جاتی اور جعفری کے پیچھے ثریا ہولے ہولے ہنسنے لگتی۔
کل شام جب یہی لڑکا ململ کا کلیوں والا کُرتہ، کھلے پائینچوں کا اُجلا اُجلا پائجامہ اور ربڑ کے باتھ روم سلیپر پہنے سگریٹوں کی ڈبیا لے کر لوٹ رہا تھا تو اس نے جعفری کی پوری کھلی ہوئی کھڑکی میں ثریا کو کھڑے دیکھا تھا جس کے سیاہ گھنگریالے بال ماتھے اور کنپٹیوں پر پسینے سے چپکے ہوئے تھے۔ ثریا نے اسے ادھر دیکھتے ہوئے پاکر انتہائی مسرت سے کھڑکی فوراً بند کر لی تھی۔ جب وہ جھروکے کے عین محاذ میں آیا تو ثریا کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس کے برآمدے میں اِدھر اُدھر چوروں کی طرح دیکھ کر ڈرتے ڈرتے کہا کہ اگر گیارہ گنتے گنتے وہ اس کھڑکی کے پاس آ کر السّلام علیکم کہہ دے تو چاہے کچھ بھی ہو میں مصافحہ کے لیے ہاتھ باہر نکال دوں گی۔ جب ثریا سات پر پہنچی تو وہ کھڑکی سے دو تین قدم آگے نکل چکا تھا۔ آٹھ — نو — دس اور پھر گیارہ میں اس نے کوئی آدھ آدھ منٹ کے وقفے دیئے۔ کچھ ایسے گنا جیسے کوئی کسی کو پکار رہا ہو مگر بدقسمت لڑکا برآمدہ عبور کر کے اندر کوارٹر میں داخل ہو چکا تھا۔ ثریا نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر کیا کہ اس نے صرف گیارہ ہی فرض کیے تھے۔ اگر خدانخواستہ گیارہ سو یا گیارہ ہزار ہوتے تو اس کا خاندان جیتے جی مر جاتا!

ان دو تین دنوں میں سورج سوا نیزے سے ڈھلک کر ایک نیزے پر آ گیا تھا اور بدستور ادھر ہی ڈھلک رہا تھا۔ امی صبح صبح ریڑھی والے سے سبزی خریدتے ہوئے تقریباً ہر روز پوچھتیں۔ "فضلو آم کیوں نہیں لاتا؟"
وہ ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہتا۔ "بیگم صاحبہ اس گرمی نے تو آدمیوں کو پکا کر ویسے ہی پھوڑا پھنسی کر دیا ہے۔ میں آم لاؤں بھی تو کون لے گا؟ یہ تو برسات کا میوہ ہے۔ ادھر کھایا ادھر ہضم۔ برکھا ہو تو دو چار ٹوکرے صاحب لوگوں کے لیے

لاؤں۔ ایسے میں ایک آدھ ٹوکرا بھی سڑ گل گیا تو میں کس کے گھر سے رقم دوں گا۔ بیگم صاحبہ دعا کیجئے، برکھا ہو، پھر آم بہت۔"

امی پوچھتیں۔ "کتنے پیسے ہوئے؟"

اور فضلو گھیا اور ٹینڈو کی قیمت لے کر آگے چل دیتا۔

نواب شاہ والے حیدر چچا کسی ضروری کام سے آج ہی یہاں آئے تھے اور کانوں کو ہاتھ لگا لگا کر دیہات کی گرمی کا تذکرہ کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی جیکٹ 'ترکی ٹوپی' سر سے اُتار کر بالوں پر ہاتھ پھیرا اور پسینے سے لتھڑا ہوا پنجہ دیوار پر مار کر بولے۔

"بھابی قسم خدا کی زمین پہلے دن کی کھیس ایسی پھٹی پڑی ہے۔ کپاس کے پودے دن بہ دن مرجھائے جا رہے ہیں۔ اگر ہفتہ دس دن اور بارش نہ ہوئی تو کاشتکار برباد ہو جائیں گے۔ نہریں بند ہیں اور پودے چھ سات دنوں سے زیادہ نہیں نکال سکتے۔ اگر اب کے روئی کی فصل ماری گئی تو سارے ملک میں کال پڑ جائے گا۔ میں نے اپنا رقبہ——"

اور ثریا نے رسالہ سے سر اٹھا کر ان کی بات کاٹ دی۔ "اور اگر بارش ہو جائے تب چچا؟"

"پھر؟" چچا کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں۔ "پھر تو گھر گھر سونے کے ڈھیر لگ جائیں ثریا بیٹی۔ اس وقت بارش کی ایک ایک بوند سونے کی مُہر ہے۔ اصلی روے کا سونا ہے۔ خدا کی قسم زندگی بن جائے۔ پیغمبروں نبیوں نے ایسے ہی بارش کو بارانِ رحمت تو نہیں کہہ دیا۔ ایک ایک قطرہ خدا کے دربار سے خوشیوں اور مرادوں کے پروانے لے کر اترتا ہے۔ بگڑے ہوئے کام بنتے ہیں۔ رُکے ہوئے چل پڑتے ہیں۔ ثریا بیٹی ہر کام پہلے خدا اور پھر بارش کی مہربانی سے ہوتا ہے۔"

اس کے بعد چچا امی سے اپنے سسرال کی باتیں کرنے لگے جن کی بڑائی کا پول روز بروز کھل رہا تھا۔

ثریا پھر رسالہ پڑھنے لگی۔

بھائی کے سکول کا ٹائپسٹ جسے انہوں نے بڑی مشکل سے سکول میں نوکر کروایا تھا، پہلے ہفتہ میں دو تین بار ان کے گھر آتا تھا اور کچھ ادھر ادھر کے کام کر دیتا تھا مگر اب دس دس دن تک اس کی شکل ہی دکھائی نہ دیتی تھی۔ سکول میں تو بھائی جان اس

سے کہتے ہی رہتے ہوں گے مگر جب گھر بھی آتا تو بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑتے۔ "یار ضیا میرا تھیسس کب ٹائپ کرو گے؟ جلد کرو گے تو تمہارا ہی بھلا ہو گا۔ کالج میں لگتے ہی تمہیں بھی وہیں بلوا لوں گا۔"

ضیا کھسیانا ہو کر کہتا۔ "ماس صاب گرمی بہت ہے، کام پہ بیٹھا نہیں جاتا۔ جس دن بارش ہوئی آپ کا تھیسس آپ سے آپ ٹائپ ہو جائے گا۔"

"وہ کیسے؟" ثریا پوچھتی تو ضیا ہتھیلی پر انگلیاں رگڑتے ہوئے کہتا۔

"سردیوں میں انگلیاں ٹھٹھر جاتی ہیں۔ گرمیوں میں پسینے کے فوارے چھوٹنے لگتے ہیں مگر برسات میں بس ٹائپ سامنے رکھ کر بیٹھ جائیے۔ بوندیاں آپ سے آپ ٹاپاٹپ کرتی جائیں گی۔" ثریا سے بات کرتے ہوئے ٹائپسٹ بھی شاعری کرنے لگتا تھا۔

فیل پاپہ کمر دھرے اور ٹانگیں صوفے پر ڈالے ثریا سونے کی کوشش میں مصروف تھی اور مانی دیوار کے ساتھ پیٹھ رگڑ رہا تھا۔ اس کی پلکوں پر آنسو دیکھ کر ثریا نے نیم باز آنکھیں ذرا کھول کر پوچھا۔ "کیا بات ہے مانی؟"

"کھجلی باجی!" اس نے منمنا کر جواب دیا۔

اور باجی نے کھنکار کر کہا۔ "کوئی بات نہیں۔"

باجی کو ایسے ملتفت پا کر مانی نے پوچھا۔ "بارش کب آئے گی باجی؟"

"جب ہم نہ ہوں گے تب۔" آنکھیں میچ کر باجی نے انہیں بازو سے ڈھانپ لیا۔

شام کو بس سگریٹ خریدنے اور ایک ذرا سی چہل قدمی کرنے کے علاوہ وہ لڑکا لمحہ بھر کو برآمدے سے باہر نہ نکلتا۔ ثریا کو اس کے گھریلو پن پر سخت اعتراض تھا مگر جس دن مولوی صاحب کوارٹروں کے تمام باشندوں کو نمازِ استقاء پڑھانے باہر کھیتوں میں لے گئے اور وہ لڑکا یہ فرض ادا کر کے تولیہ سر پر ڈالے واپس لوٹا تو اس کا چہرہ چقندر کی طرح سُرخ ہو رہا تھا اور اس کے پاؤں ٹھیک سے زمین نہیں پکڑتے تھے تو ثریا کو مولوی صاحب پر غصہ آیا کہ ایک کے نہ جانے سے کیا ہو جاتا بھلا۔ اس نے سوچا ایسا نارمل اور شائستہ لڑکا اس کڑکتی دھوپ میں لائن میں آخر کیسے نکل سکتا ہے۔ اچھا ہی

کرتا ہے جو چھت تلے رہتا ہے۔ جعفری کے پیچھے سے ثریا نے آسمان کو دیکھنا چاہا کہ شاید بادلوں کا کوئی ٹکڑا۔ مگر اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

اس ونگ میں رہنے والے سب بچے شام کو ثریا باجی والی لین میں سرکنڈے کی وکٹیں گاڑ کر کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ ایک تو یہ لین کافی چوڑی تھی، دوسرے ٹیم کے کیپٹن کا یہ خیال تھا کہ یہاں کی پچ بہت اچھی تھی۔ اکثر وہ لڑکا بھی اس کے ساتھ شامل ہو جاتا مگر دو اننگ کے بعد اسے ایک باری ملتی تھی اور باؤلنگ کی اجازت نہ تھی۔ ثریا ہر روز جعفری سے لگ کر ٹیسٹ میچ دیکھا کرتی مگر اس لڑکے کی حرکات سے کبھی یہ ظاہر نہ ہوا کہ اسے جعفری کے پیچھے کسی کی موجودگی کا پورا پورا احساس ہے۔

ایک ایسی ہی امسی ہوئی شام کو جب پدا ایمپائر اچھے اچھے باؤلروں کی پھینکوں پر نو بال دے رہا تھا تو تمام کھلاڑیوں نے ہوا میں انگلیاں اٹھا کر "ہاؤ زیٹ! ہاؤ زیٹ" کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ پدّا کہہ رہا تھا کہ مَیں کیا کروں پچ خراب ہے اور گڑھوں سے بال اچھلتا ہے تو میں نو بال دینے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ ٹیم نے اس کی ایک نہ مانی اور بھائی جان کو ایمپائر بناؤ کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ ثریا ہنسنے لگی اور اس لڑکے نے ہوا میں خلیل جبران کی سی انگلی اٹھا کر کہا۔ "دیکھو آج ایمپائر نہیں بدل سکتا بلکہ اس وقت تک نہیں بدل سکتا جب تک کہ پچ ٹھیک نہ ہو جائے، ٹوپیاں لگے، نیکریں کسے اور شلواریں اُڑسے بچے پھر نعرے لگانے لگے۔ "پچ ٹھیک کرو، پچ ٹھیک کرو۔" ثریا کو ہنسی کا دورہ سا پڑ گیا۔ اس نے پھر ہوا میں ہاتھ بلند کیا اور کہا۔ "ان دنوں پچ ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ جب بارش ہو گی تو ہم سب کُھرپوں اور کدالوں سے زمین ہموار کریں گے۔ سیلی مٹی کوٹ کوٹ کے بٹھائیں گے اور میٹنگ بچھا کے کھیلا کریں گے۔"

پدّے نے کہا۔ "پھر ہم اعلیٰ وکٹیں بھی لے آئیں گے۔"

اس نے ایمپائر کا سر تھپتھپا کر کہا۔ "ضرور!"

مانی نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "آپ چلے تو نہیں جائیں گے؟"

"ہرگز نہیں۔" اس نے مانی کو اٹھا کر کندھے پر بٹھا لیا۔ "مَیں جانے کے لیے تھوڑی آیا ہوں۔"

ثریا نے شرما کر دوپٹے کا پلو انگلی پر لپیٹنا شروع کر دیا۔ اسے یوں لگا جیسے توازن

قائم نہ رکھ سکنے کی وجہ سے اس نے غیر ارادی طور پر کسی کے سر کے بال دونوں چنگلوں میں جکڑ لیے ہوں۔

کھیل پھر شروع ہو گیا۔ اب وہ آف بریک پر کیچ پکڑنے کے لیے جعفری کی کھڑکی کے عین پاس کھڑا تھا۔ ثریا نے پیچھے سے دیکھا، اس کی ایک قلم دوسری سے قدرے بڑی تھی اور گردن پر دائیں جانب ایک چھوٹا سا سیاہ تل تھا، ململ کا کُرتہ اس کی ساری کمر پر پسینہ سے چپکا ہوا تھا اور جسم کی مسلسل حرکات سے اس پر بے شمار چوکور خانے ابھر آئے تھے۔ جب وہ گیند پکڑنے کو آگے بڑھتا تو ململ کے اس ریکٹ کے بہت سے خانے مٹ جاتے اور کئی نئے اُبھر آتے۔ جانے کس نے ہٹ لگائی اور وہ آگے جھک کر گیند دبوچنے لگا اور محور پر تیزی سے گھومتا ہوا گیند اس کی ٹھوڑی کو ریتی چٹا کر آگے نکل گیا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار ٹھوڑی سہلانے لگا تو جھروکے سے ایک قہقہہ بلند ہوا۔ اس نے پیچھے گھوم کر دیکھا اور پیشتر اس کے کہ ثریا کھڑکی بند کرتی، اس نے سر ہلا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔ "خدا کی قسم تم ہنس رہی ہو۔ میری جلد کو چیونٹیاں نوچنے لگی ہیں۔" ثریا مسکرائی تو وہ آگے سرک آیا۔ کھڑکی بند ہو گئی اور لڑکی دُور ہو گئی۔

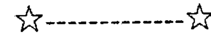
باوجود اس کے کہ دوپہر کو ثریا ایک منٹ کے لیے بھی نہ سو سکی تھی، اس پر بھی اسے ساری رات نیند نہ آئی۔ خدانخواستہ اس واقعہ کی وجہ سے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ کب صبح ہو اور کب وہ امینہ کو جا کر سارا واقعہ سنائے۔

اگلے دن امینہ کے چھوٹے سے کمرے میں ابھی وہ ٹیبل فین چلا کر بیٹھی ہی تھی اور ابھی اس کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ کھٹاک سے کمرے کا پٹ بھڑا۔ ٹھنڈی ہوا کا وہ جھونکا جس میں تازہ تازہ بھوسے کی خوشبو کے علاوہ سچ مچ تنکے بھی ہوتے ہیں، اندر گھس آیا۔ دونوں پر ایک کپکپی سی طاری ہو گئی۔ باہر سے مالی چلّایا۔ "بادل۔" برآمدے سے ڈیڈی کی آواز آئی۔ "بارش۔" پھر روشندانوں کے چھجوں پر ٹپاٹپ بوندیں گرنے لگیں۔ امینہ نے اسے لاکھ روکا، منتیں کیں، کار میں چھوڑ آنے کا وعدہ کیا مگر وہ برقعہ لپیٹتی بس سٹینڈ کی طرف بھاگ گئی۔

موسلا دھار مینہ برس رہا تھا اور ڈرائیور کافی تیز بس چلا رہا تھا۔ اس پہ بھی اس

کے ہونٹ آپ سے آپ کہہ رہے تھے۔ تیز چلاؤ اور تیز چلاؤ۔ ہر سٹینڈ پر جہاں بس ایک آدھ منٹ کے لیے رکتی، وہ جلدی جلدی کہتے ہوئے دونوں ہاتھ ہلانے لگتی جیسے عمر بھر کی محنت کا ثمرہ اس کی آبی تصویروں کا مجموعہ کوٹھے پر کھلا رہ گیا ہو۔

جب وہ گھر کے بس سٹینڈ پر اتری تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اپنی لین میں داخل ہونے سے پیشتر اس نے نقاب کے دونوں کنارے مضبوطی سے مٹھیوں میں بھینچ لیے۔ تند و تیز جھپاکوں میں جب نقاب کی بھیگی ہوئی جالی سے اس نے آگے دیکھا تو لطیف صاحب کے کوارٹر پر ایک تانگہ کھڑا تھا۔ تانگہ والا سیاہ ٹرنک آگے پھنسا رہا تھا اور سواری ہاتھ میں ایک لمبی سی ولایتی بنسی تھامے کھڑی تھی۔ جب اس نے اپنے برآمدے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو چھن چھن بھیگے ہوئے گھنگھرو بجاتا گھوڑا آگے کو چل دیا۔ ثریا نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہی نہیں بلکہ اپنے نقاب کے کنارے بھی چھوڑ دیئے۔



ایل ویرا

ایک گز! دو گز۔۔۔ تین گز!

جہاز نیپلز کے گھاٹ سے آہستہ آہستہ دور ہو رہا تھا اور مسافر ریلنگ کے پاس بے تابی سے رومال ہلا رہے تھے۔ گینگ وے اٹھنے سے ذرا پہلے بارش شروع ہو گئی تھی اور اب جب جہاز دھیرے دھیرے اپنا رُخ بدل رہا تھا، پھوار عرشہ کی طرف لپکنے لگی تھی اور لوگ جنگلے سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ گھاٹ پر الوداع کہنے والوں میں سے چند ایک نے اپنے اوور کوٹ الٹ لیے اور باقی برآمدے میں چلے گئے۔ اُلٹے ہوئے کوٹوں کے مومی استروں پر بارش کی بوندیں ایک دوسری کے پیچھے تیزی سے پھسلیں۔ نمی سے بوجھل رومال عقیق کے ٹوٹے پتے کی طرح دائیں بائیں بے معنی سی قوسیں کاٹنے لگے اور جہاز اور دُور ہو گیا۔ نیچے گھاٹ کے سنگین پشتے اور جہاز کی دیوار کے درمیان ساکن پانی چھپاک چھپاک بولنے لگا۔ میرے قریب ہی آنسو بہاتی ایک دھان پانی سی لڑکی نے بڑے زور سے Adiocaroladio کہا مگر پانی کا ایک بڑا سا چھپاکا اس کی آواز نگل گیا۔ بارش کی بوندوں کے پیچھے بندرگاہ کی روشنیاں آنسو بن کر گلتی جا رہی تھیں اور ان کی کرنوں کو مینہ کے اندھے شیشے نے کاٹ کاٹ کے دھندلا دیا تھا۔

میں نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لی اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کچھ مسافر رو رہے تھے۔ کچھ انہیں تسلیاں دے رہے تھے اور باقی خاموشی کے ساتھ انہیں تکتے جا رہے تھے۔ مَیں نے اپنے کوٹ کی بھیگی ہوئی آستین کو دیکھا۔ اس میں سے فینائل، فلالین اور پٹرول کی بو آ رہی تھی۔ معاً مجھے خیال آیا کہیں میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو تو نہیں اُمڈ آئے؟ میں نے پوٹوں سے پپوٹوں کو چھوا تو آنکھیں بدستور چھالیا کی

طرح خشک اور سخت تھیں۔

ڈیڑھ برس روما میں بڑے سکون سے گزرا تھا۔ نہ فکرِ فردا، نہ غمِ دوش! دفتر سے تنخواہ مل جاتی تھی۔ گھر سے خیریت کا خط آجاتا تھا۔ دوست سینما یا تھیٹر کی دعوت بھیج دیتے تھے اور میں کارپوریشن S.P.Q.R کا سربمہر دودھ پی کر آرام سے سو جاتا تھا کہ ایک دن امریکہ سے ایک پاکستانی طالب علم وطن لوٹتے ہوئے چند دن میرے مہمان ٹھہرے۔ مَیں نے استطاعت سے بڑھ کر ان کی خاطر مدارت کی۔ اچھے ریستوران میں کھانا کھلایا۔ اچھے کلب میں شب بسری کا بندوبست کیا۔ فرسکاتی لے جاکر دینو پلائی۔ یونیورسٹی کے پروفیسروں سے ملایا۔ ریڈیو روم کے فنکاروں سے تعارف کرایا۔ آخری رات روم کی مخصوص گلیوں میں ان کے تقاضوں کی ترجمانی کی۔ بھاؤ پوچھے، رعایت کی درخواستیں گزاریں۔ بدقسمتی سے سودا طے نہ ہو سکا اور بنجارہ گھاٹا ٹوٹا کھا کے وطن واپس گیا تو اس نے راولپنڈی جاکر میرے ایک دوست کے کان یوں بھرے کہ میاں صاحبزادے جیسے کورے یہاں سے گئے تھے، ویسے ہی کورے بیٹھے ہیں، نہ سیکھا نہ سکھایا نہ پڑھے نہ گنے!

سردیوں کی ایک دھندلی شام کا ذکر ہے کہ مجھے راولپنڈی سے ایک تہدید آمیز خط ملا۔ الفاظ کا کوئی ایسا تیر نہ تھا جسے طعن و تشنیع کے پیکاں سے سجایا نہ گیا ہو۔ خط میں میری کم ہمتی، بزدلی اور کوتاہ آستینی کا رونا رویا گیا تھا اور ہر تان کسی نہ کسی نفسیاتی مسئلے پر ٹوٹتی تھی۔ مضمون میں کہیں بائرن کی شاعری تھی۔ کہیں گوگیں کے رنگوں کی آمیزش تھی۔ اِدھر اُدھر بودلیر کی کالی حبشنیں آنکھ مار رہی تھیں۔ مضمون کے معجون نے مجھے سنکھیے کا کشتہ سا بنا دیا۔ میں نے ریڈیو سٹیشن سے نکلتے ہی ٹھاکر کو کندھے سے پکڑ لیا اور ہاتھ ہوا میں لہرا کے کہا۔ "چلو دیّا توسکانا چلتے ہو؟"

ٹھاکر نے بھرپور نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور پھر نظریں زمین پر گاڑ دیں۔ ایک مرتبہ پھر سر اٹھایا۔ میرے دل پر ہاتھ رکھا اور پوچھا۔ "سچ؟"

مَیں نے چابی جیب سے نکال کر جواب دیا۔ "ٹینکی پٹرول سے لبالب بھری ہے۔ سڑکیں دھلی دھلائی رکھی ہیں اور ہمیں کوئی کام نہیں۔ تم ساتھ دو تو——"

اس نے میری بات کاٹ دی۔ "ارے مورکھ میرا تو جنم مرن کا ساتھ ہے تو

سنگی بنے جب نا——دیو سوگند تو چلے تو کلا جگ جائے۔"

مَیں نے معاملہ کی اہمیت کم کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھاکر مَیں تو آتا جاتا ہی رہتا ہوں۔ کہے تو آج تیرا شِپّا بھی لڑا دوں۔"

ٹھاکر کے تن مُردہ میں جان آگئی۔ اس نے عین اطالویوں کی طرح کندھے سکوڑ کر کہا۔ "نجانے کیوں میرا تو ہردے کانپنے لگے ہے۔"

مجھے خط کا مضمون یاد تھا۔ ٹھاکر کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔ "برخوردار یہ ہردے وردے کچھ چیز نہیں، یہ سب مدر فگّر ہے مدر فگّر اور یہ سائیکالوجی کی ایک چیز ہوتی ہے۔ مگر تم اسے نہیں سمجھوگے۔ چلو جلدی کرو۔"

اس کے بعد مَیں اور ٹھاکر ایک دوسرے کے پروں پر اپنا آپ تول کر موٹر میں بیٹھ گئے۔

مینہ کے پانی سے سڑکیں دھل کر خشک ہو چکی تھیں اور ان پرنی آت کے گھِسے ہوئے ٹائروں کی آواز نئے پہیوں کی صدا بن کر گونج رہی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکوں سے درختوں کی شاخیں بارش برساتیں تو ہماری موٹر کی آواز اور امیرانہ ہو جاتی۔ دیّا توسکانا پہنچتے پہنچتے بتی جلانے کا وقت آگیا اور جب ہم نے درختوں کے درمیان گھری ہوئی سنسان سڑک پر موٹر روکی تو ایک بھاری بھرکم عورت اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اس نے بونٹ پر انگلی بجا کر بڑے ہی پیارے انداز میں کہا۔ "صدقے ذرا تیز بتی روشن کرنا۔"

مَیں نے بڑی ہمت سے کہا۔ "بس اس سے زیادہ تیز نہیں ہو سکتی۔" اس نے مٹھی کھول کر لیرے گنتے ہوئے کہا۔ "چلو جانے دو، یہی کافی ہے۔" مَیں نے پیچھے مڑ کر ٹھاکر سے پوچھا۔ "اسے بلاؤں؟" ٹھاکر سہم کر جلدی سے بولا۔ "جانے دو جی یہ تو بہت موٹی ہے آگے چلو!" وہ پیسے گن کر ہماری طرف بڑھی تو ہم نے کار آگے سرکالی اور اس سے کوئی سو گز کے فاصلہ پر جا کھڑے ہوئے۔ درخت کی اوٹ سے ایک پستہ قد مگر نوجوان عورت آگے بڑھی اور اس نے کھڑکی سے دونوں بازو کہنیوں تک اندر بڑھا کر پوچھا۔ "اکیلے ہو؟"

"نہیں دو۔" ٹھاکر جی گھبراہٹ میں بول اٹھے۔

"ذرا ٹھہرو۔" اس نے بازو باہر نکالتے ہوئے کہا اور پیچھے مڑ گئی۔

مَیں نے پوچھا۔ "یہ ٹھیک ہے ٹھاکر جی؟"

تو ٹھاکر نے ایک لمبی سی ہوں کے ساتھ کہا۔ "بھلی ہے جی۔"

اسی اثناء میں وہی بھلی اٹھارہ بیس سال کی ایک لمبی سی لڑکی کو ساتھ لے کر آ گئی۔ میں نے کار کا دروازہ کھولا تو ٹھاکر جی نے آہستہ سے کہا۔ "حساب کتاب پوچھ لو جی۔ یہ پردیسیوں کی حجامت بنا دیتی ہیں۔"

لمبی لڑکی نے ہماری بولی سُن کر ہولے سے کہا۔ "پردیسی معلوم ہوتے ہو؟"

مَیں نے کہا۔ "ہاں میرا دوست پردیسی ہے اور مَیں اس سے اس کی ملکی زبان سیکھ رہا ہوں۔" اس پر اس نے کوئی جواب نہ دیا تو میں نے کھنکار کر کہا۔ "ہاں جی تو فرمایئے؟"

وہ بھلی ہنس پڑی اور اپنی انگوٹھی سے موٹر کی چھت ٹکٹکا کر بولی۔ "ہم کیا فرمائیں، آپ ہی بتایئے —— دو ہزار لیرے ہوں گے۔"

"چودہ روپے!" ٹھاکر نے جلدی سے حساب لگایا۔

"دس۔" مَیں نے غلطی نکالی۔

"دس تمہارے دیش کے، ہمارے تو چودہ ہی ہوئے نا۔"

میں نے ٹھاکر کی بات کا جواب دیئے بغیر بڑے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "جلدی کرو۔" اور انجن سٹارٹ کر لیا۔

بھلی نے کہا۔ "تو پھر منظور ہے؟"

میں نے کہا۔ "منظور ونظور کچھ نہیں، دیکھا جائے گا۔"

اس پر دبلی پتلی دوسری لڑکی نے تنک کر کہا۔ "ہم مستقبل کے قائل نہیں، پہلے بات طے ہونی چاہیے۔"

بھلی واقعی بڑی بھلی لڑکی تھی۔ اس نے آشتی بھرے لہجے میں کہا۔ "جھگڑا کس بات کا، بعد میں سہی مگر ذرا جلدی کرو۔ ان دنوں پولیس ادھر دوش مار رہی ہے۔"

ٹھاکر جی اور بھلی لڑکی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور میرے کھاتے میں انہوں نے وہ بدتمیز اور بد دماغ لڑکی ڈال دی۔ میں موٹر چلا رہا تھا اور پسینے کے باعث سٹیئرنگ

میرے ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ جاتا تھا۔ باری باری میں دونوں ہاتھ اپنی ران پر رگڑ کر خشک کرتا۔ سگریٹ پہ سگریٹ سلگاتا، اسپغول کے چھلکے اور بہی دانہ کا جو مغلوبہ میرے حلق میں ابھرتا، اسے بار بار نگلتا۔ میرے باپ دادا کی بڑی بڑی سفید پگڑیاں میرے پیر چچا کی دستار مبارک، ہمارے مزارعوں کی اٹھتی ہوئی انگلیاں اور ہمارے ملازموں کی دبی دبی ہنسی ایک ساتھ موٹر کے پہلو میں اڑی آتی تھی۔ اچانک پچھلی سیٹ پر کھٹ سے کچھ ہوا۔ ٹھاکر جی نے مدر فکر کی پون چکی پر دون کخوتے کا وار کر دیا تھا۔ میں نے بات ٹالتے ہوئے اپنی لڑکی سے پوچھا۔ "ابھی کتنی دور اور چلنا ہے؟" اس نے آہستہ سے کھنکار کر کہا۔ "ابھی آبادی ختم ہوتی ہے ابھی کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔" میں نے پھر سڑک پر نگاہیں جما لیں۔ ٹھاکر جی نے میری نشست کی پشت پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بڑی بدتمیز ہے جی یہ لڑکی۔"

میں نے کہا۔ "پردیس میں یونہی ہوتا ہے ٹھاکر جی۔ دھیرج سے کام لو۔" دراصل میں اپنا دھیرج بندھا رہا تھا۔

میری سہیلی نے کہا۔ "رکو۔" اور ہم نے کار سڑک کے کنارے کھڑی کر لی۔

وہاں کھیتوں کے کنارے پہلے ہی چند کاریں، موٹر سائیکل اور سکوٹر کھڑے تھے۔ جب ہم اترے تو دونوں لڑکیاں ہماری قیادت کرنے لگیں۔ چند قدم چلنے کے بعد بھلی نے کہا۔ "بس یہی جگہ ٹھیک ہے۔ یہ درخت ہمارا، وہ تمہارا۔"

میں نے ایک نظر اپنے درخت کو دیکھا۔ کچھ اسی قسم کے نیم کے ایک پیڑ تلے میری نانی محلّہ کی لڑکیوں کو قرآن اور احوال الآخرت پڑھایا کرتی تھیں۔ لڑکیاں چادروں کی بکلیں مارے، ماتھے تک اوڑھنیاں کھینچے تلاوت کیا کرتیں۔ ہم آستینیں چڑھائے اور نیکریں پہنے ان کے قریب سے گزرتے تو وہ ساری کی ساری رحل اپنے آنچل میں چھپا لیا کرتیں۔ میں نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ "نہیں، یہ جگہ ٹھیک نہیں۔" ٹھاکر جی میرا سہارا پا کر بولے۔ "تم یورپی لوگوں کو شرم بھی نہیں آتی۔" اس پر میری لڑکی نے پلٹ کر جواب دیا۔ "تم کو بڑا حجاب ہے نا، جبھی موٹروں میں گھومتے پھرتے ہو۔"

مَیں نے چلّا کر کہا۔ "بکواس بند کرو۔"

بھلی خوش ہو کر بولی۔ "عملی بات ہوئی نا۔"

میں نے کہا۔ ”کچھ عملی وملی نہیں، ہم یہاں ایک لمحہ رکنے کو بھی تیار نہیں۔ ہم آگے چلیں گے۔“

”ہم آگے نہیں جائیں گے۔“ میری لڑکی نے سر اٹھا کر جواب دیا۔

”ضرور جائیں گے۔“ میری جھلاہٹ غصے میں تبدیل ہو گئی۔

ٹھاکر نے ہولے سے کہا۔ ”جھگڑتے کیوں ہو جی، جانے دو۔ ویشیا کا یہی کام ہے۔“

”موٹر میں چل کے فیصلہ کرتے ہیں۔“ بھلی نے موقع کی نزاکت کا احساس کیا اور ہم موٹر کی جانب چل دیئے۔

جب مَیں نے گاڑی سٹارٹ کی اور آگے کی طرف چلنے لگا تو میری سہیلی نے بائیں ہاتھ سے سٹیئرُ روما کی طرف کاٹنا شروع کر دیا۔ میں دوسری طرف گھماتا تھا اور وہ اپنے رُخ پھرائے جاتی تھی۔ موٹر ایک کنارے سے دوسرے کنارے بدمست شرابی کی چال چلنے لگی۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور مَیں نے ایک ضدی آگ بھبھوکا بچّے کی طرح اس کی کلائی پر زور سے تھپڑ مارا۔ اس کی طلائی پہنچی کی زنجیر میں قدیم رومن شہنشاہوں کا لٹکتا ہوا سکہ جھول کر میری ایک پور پر لگا اور اس کا ہاتھ آپ سے آپ پھسل کر اس کی گود میں جا گرا۔ اس نے مُڑ کر میری طرف عجیب و غریب نظروں سے دیکھا۔ پھر کہنے لگی۔ ”سینور ہم آگے نہیں جائیں گے۔“

”کیوں آخر؟“ میں نے کہا۔ جیسے میرا مطلب ہو۔ ”ہمارے حرم کو یہ جرأت کیونکر ہوئی۔“

”بس ہم نہیں جائیں گے۔“ بھلی نے وجہ بیان کی۔

”مگر کیوں؟“ ٹھاکر جی نے دبی زبان سے پوچھا۔

”اس لیے کہ روما کی حد یہیں ختم ہو جاتی ہے۔“ میری لڑکی نے کہا۔ ”اور آگے ”دوئے پونتی“ نیا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔“

”اس کا مطلب؟“ مَیں نے اطمینان سے پوچھا۔

”یہی کہ ہم روما کی حد عبور کرنا مناسب نہیں سمجھتیں۔“

”کیوں؟“ مَیں نے ماتھے پر سلوٹ ڈالے۔

”بس اسی لیے کہ ہم مناسب نہیں سمجھتیں۔“ بھلی نے ایک اور وجہ بیان کی۔

مَیں نے کہا۔ ”مگر ہم تو مناسب سمجھتے ہیں اور ہم دوئے پونتی جا کر ہی دم لیں گے۔“

بھلی نے چمک کر کہا۔ ”تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ ہم دوئے پونتی کے تھانے میں تمہارے خلاف رپٹ دے دیں گی۔“

میں نے جوش میں آ کر کہا۔ ”تم چاہے صدر جمہوریہ کو رپٹ دے دو۔ کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

بھلی نے کہا۔ ”ہم شور مچائیں گی۔ چور، بدمعاش، ڈاکو کہہ کر پکاریں گی اور تمہیں بستی کے لوگوں کے حوالے کر دیں گی۔“

ٹھاکر نے کہا۔ ”واپس چلو جی ویشیا کا کیا اعتبار!“

مَیں نے خوفزدہ ہو کر چلاّ کے کہا۔ ”دیکھا جائے گا۔“ اور موٹر اور تیز کر دی۔

بھلی لڑکی نے زور کی چیخ ماری اور میرا اور ٹھاکر کا کلیجہ دہل گیا۔ میں نے موٹر روک لی۔ دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ شدید خوف اور اس کے ردعمل، ڈر اور جھلّاہٹ سے مَیں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ دوسرا دروازہ کھول کر مَیں نے اپنی ساتھی کو بازو سے پکڑ کر باہر کھینچا، پھر ٹھاکر کی بھلی لڑکی کو گھسیٹ کر سڑک پر گرا یا۔ دروازہ بند کیا اور موٹر گھما کر روما کی طرف رخ کر لیا۔ بھلی کی فحش گالیاں بڑی شدت سے ہمارا تعاقب کر رہی تھیں اور ٹھاکر اپنی سیٹ پر پتے کی طرح کانپتا ہوا کہہ رہا تھا۔ ”حرامجادیاں ساری رات چلتی رہیں تو بھی روما نہ پہنچ پائیں گی۔“ میں نے مڑ کر دیکھا۔ بھلی پر ہسٹیریا کی کیفیت طاری تھی اور لمبی لڑکی خاموشی سے اسے سہارا دیئے چلی آ رہی تھی۔ ٹھاکر نے کہا۔ ”تم نے بھلا ہی کیا جی، نہیں تو سر کو آ جاتیں۔“

مَیں نے موٹر روک کر بیک کرنی شروع کی اور عین ان کے قریب پہنچ کر روک لی۔ باہر نکل کر مَیں نے دیکھا کہ لمبی لڑکی کی کمر اس قدر تنگ تھی کہ وہ زرد رنگ کے لمبے کوٹ میں بھڑ سی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے ساتھ بھلی اور بھی پستہ قد ہو گئی تھی۔ مجھے ایک مرتبہ اپنے سامنے پھر اس طرح کھڑے دیکھ کر وہ مجھ پر جھپٹی مگر بھڑ نے

اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر زور سے اپنی طرف کھینچ لیا۔ موٹر کا دروازہ کھول کر میں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ "تشریف رکھیے۔"

جب ہمارا کارواں پھر روانہ ہوا تو میں نے اطمینان سے کہا۔ "یہ نہ سمجھئے گا کہ میں نے آپ سے ڈر کو موٹر بیک کی ہے۔ آپ کا پروگرام اب بھی رپٹ کرانے کا ہو تو کار کا نمبر نوٹ کر لیجیے۔ میرا شناختی کارڈ دیکھ لیجیے۔ میں دانش گاہ روم کے شعبۂ شرقیات میں اردو پڑھاتا ہوں اور اطالوی نہیں ہوں۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں۔ آپ کے جی میں جو آئے سو کیجیے۔" بھلی اب بھی ہولے ہولے گالیاں دے رہی تھی اور ٹھاکر بڑے پیار سے اس کا کندھا تھپتھپا رہا تھا۔ میں نے ایک نظر زنبور کو دیکھا وہ خاموشی سے دونوں ہاتھ گود میں ڈالے شیشے سے باہر چاندنی کا نظارہ کر رہی تھی۔

ویاتوسکانا پہنچنے سے پہلے میری ساتھی نے کہا۔ "بس یہیں روک لیجیے، ہم یہیں اُتریں گے۔"

گاڑی رُکی۔ اس نے دروازہ کھول کر ابھی ایک پاؤں ہی زمین پر رکھا تھا کہ میں نے اس کی کلائی تھام کر پوچھا۔ "زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟" میں بھی عجیب احمق تھا، بچوں کی طرح تھپڑ چلانے لگا۔

اس نے مسکرا کر کہا۔ "چوٹ کیسی، مجھے تو یاد بھی نہیں رہا۔"

دو ہزار لیرے نکال کر میں نے اس کے ہاتھ میں دیئے تو وہ ذرا جھجکی پھر انہیں پرس میں ڈال کر موٹر سے باہر نکل گئی۔ سیٹ کی پشت پر جھک کر میں نے بھلی کو دو ہزار لیرے دیتے ہوئے کہا۔ "امید ہے اب آپ ہم سے ناراض نہیں ہوں گی۔"

اس نے نچلا ہونٹ ڈھیلا چھوڑ کر بڑی مشکل سے "نہیں" کہا اور لیرے گویا میرے ہاتھ سے چھین کر دروازہ کھول کر ایک دم نجانے کہاں غائب ہو گئی۔

ٹھاکر نے شکوہ آمیز لہجے میں کہا۔ "تم نے یہ کیا کیا جی؟"

میں نے کہا۔ "تم چپ رہو، تم مدر فلگر کے مارے ہوئے ہو۔" اور کار سٹارٹ کر لی۔

یونیورسٹی کا سالانہ ڈنر تھا۔ باؤسانی، فیراکوتی، دی پتیر دادر میں ایک کونے میں

اپنی مخصوص گپیں اڑا رہے تھے کہ ٹیلی ویژن کیمرے کی ٹرالی ہماری طرف لپکی۔ ہم سب نے اپنی اپنی ٹائیاں درست کیں، کالروں کے کان سیدھے کیے اور ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھنے لگا۔ جونہی کیمرے کا گوشۂ چشم ہماری طرف منعطف ہوا۔ میں نے جھٹ سے اپنی قراقلی گود سے اٹھا کر سر پر رکھ لی۔ کومنٹری دینے والے نے یونیورسٹی کے صاحبِ رسومات سے میری بابت پوچھا اور مائیک پر اس کی گفتگو کا سلسلہ 'پاکستان' کے۔ٹو کی چوٹی، بنگال کے شیر کپلنگ کے کم اور زمزمہ سے جاملا۔ فیراکوتی نے اپنی مرغوب فارسی ترکیب استعمال کرتے ہوئے باؤسانی سے کہا۔ "یہ پدر سوختہ بڑا چالاک ہے۔"

باؤسانی نے ٹوئیاں طوطے کی طرح سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "در ایں چہ شک" اور میں نے بات کا رخ جلدی سے دی پتیر و کی طرف پھیر دیا۔ ابھی ہم اس نازک مرحلے پر پہنچنے بھی نہ پائے تھے جس سے دی پتیر و چڑتا تھا کہ ہماری میز پر یونیورسٹی کے ریکٹر صاحب آ گئے۔ ہمیں اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اٹھنا پڑا۔ ریکٹر صاحب نے ہمیں ہاتھ کے اشارے سے اور فیراکوتی کو بازوؤں سے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "ذرا میرے ساتھ چلیے ستاتالی کا نوابی خاندان آپ سے ملنے کا متمنی ہے۔" میرے بھاگ جاگ اٹھے۔ قراقلی کو پھونک مار کر اور ٹائی کی گرہ ایک مرتبہ پھر جھاڑ کر میں نے کہا۔ "چلیے!"

باؤسانی نے آہستہ سے کہا۔ "بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش۔"

فیراکوتی بولا۔ "پدر سوختہ۔"

اور میں ریکٹر صاحب کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

اطلس و کمخواب منڈھی کرسیوں پر ایک دائرے میں نوابی خاندان فروکش تھا۔ وسطی کرسی پر پچاس پچپن برس کی ایک بڑھیا جلوہ افروز تھیں۔ ان کے سر پر سرخ مخمل کی ٹوپی بائیں کان اور کنپٹی کو اپنی لٹک میں چھپائے تھی اور ناک کی خمیدہ چونچ اوپر کا ہونٹ چھو رہی تھی۔ اطلس و کمخواب اور سنہری گوٹ سے سجی ہوئی آبنوسی کرسی میں نواب بیگم کڑک لیگ ہارن کی طرح بیٹھی تھیں اور ان کے سگریٹ سے وابستہ راکھ کی لمبی سنولائی ہوئی کونپل گرنے ہی والی تھی۔ ریکٹر صاحب نے ذرا سے ایک طرف ہو کر ہاتھ کے ایک لطیف اشارے سے کہا۔ "سوا اِتیچے لینسا بارونیتا ستاتالی۔"

میں نے ایڑی ملائی، پنجے جوڑے، بایاں ہاتھ پہلو سے لگا کر نوے درجے کا زاویہ بنایا۔ بڑی کوشش سے آواز میں جگنو بھر کر ''اونوراتو!'' کہا اور نواب بیگم کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر پشت دست سے کوئی ایک انچ اوپر لبوں کی ہولے سے چٹکی بجائی اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

ریکٹر صاحب نے ہاتھ سے پھر ویسا ہی اشارہ کیا۔ ''کیاریسما سینورینا ماریا ستاتالی۔''

میں پھر جھکا اور اب کے میرے ہونٹ پشت دست سے کوئی ادھ انچ اوپر رہے۔ اشارہ ہوا میں پھر لہرایا۔ ''کیاریسما سینورنا آنا۔''

جب کیاریسما آنا کے ہاتھ سے میرے لب چھوئے تو کیاریسما سینورنیا ماریا نے گوشہ چشم سے دیکھا۔

ریکٹر صاحب نے کہا۔ ''سوا اپچے لینسا بارونے ستاتالی۔''

اب کے میرے جسم نے کچھ ایسا خم نہ کھایا اور میں نے ہاتھ کو ایک ہلکا سا جھٹکا دے کر ''اونوراتو'' کہا اور مسکرانے کی کوشش کی۔

ریکٹر صاحب نے کہا۔ ''مائیسترو ستاتالی۔''

اب گویا میں خم ٹھونک کے کھڑا ہو گیا اور گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر کہا۔ ''آن شانتے۔'' اتنے میں نواب بیگم کے سگریٹ کی راکھ ان کے سکرٹ پر گر گئی اور سب اپنے اپنے رومال نکال کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے اپنا رومال جیب سے نکالنا اس لیے مناسب نہ سمجھا کہ وہ جگہ جگہ سے چپکا ہوا تھا۔

ریکٹر صاحب مجھے بٹھا کر اور معذرت طلب کر کے چلے گئے۔ باتیں شروع ہوئیں اور بازونیتا ستاتالی نے بڑے مربیانہ انداز میں پوچھا۔ ''کیاریسمو پروفیسور نے وطن چھوڑے کتنی مدت ہوئی ہے؟''

''کوئی ڈیڑھ سال۔'' میں نے جی ہی جی میں ہاتھ باندھتے ہوئے عرض کی۔

''روما پسند آیا؟'' حضور بارونے پوچھا۔

''جی بہت۔''

''کب تک اور ٹھہرنے کا ارادہ ہے؟''

''حضور دانے دانے پر مہر ہوتی ہے۔'' میں نے خالص مشرقی انداز میں کہا۔

''دیکھا امی۔'' کیاریسما سنور نیا ماریا نے کہا۔ ''مشرق کے لوگ بڑے خدا پرست ہوتے ہیں اور ہر چیز منجانب اللہ تصور کرتے ہیں۔''

''مگر یہ دانے دانے پر مہر کا کیا مطلب؟'' سینور بارونے پوچھا۔

''حضور۔'' میں نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ''اناج کا ہر وہ دانہ جو ہم کھاتے ہیں، ہمارے نام اور پتہ کا حامل ہوتا ہے۔ ہم نہ اس سے زیادہ کھا سکتے ہیں نہ کم۔''

''مگر ہمیں تو کوئی مہر دکھائی نہیں دیتی۔'' چھوٹے مائسترو نے حیران ہو کر کہا۔

''جناب اس کے لیے صوفی کا دل اور یوگی کی آنکھ چاہیے۔ اور اگر——''

مگر سینور بارونے میری بات کاٹ دی اور مسکرا کر پوچھا۔ ''پروفیسوزے آپ بھی یوگا جانتے ہیں؟''

''جی کیوں نہیں۔'' میں نے سر جھکا کر عاجزی سے جواب دیا۔

''کر کے دکھاؤ۔'' مائسترو بے تاب ہو گیا۔

''ہوں ہوں۔'' سینورنا آنا نے تادیبی نگاہوں سے گھورا۔ اور میں خاموش ہو کے رہ گیا!

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' جناب بارو راکھ دان میں پائپ جھاڑتے ہوئے بولے۔ ''ہمیں بھی نوابی خدا ہی کی طرف سے ملی تھی۔''

''تھی کیوں؟ ہے!'' تینوں ماں بیٹیاں یک زبان ہو کر بولیں اور نواب صاحب چپ ہو گئے۔

''کوئی ایک دو سال تو اور ٹھہریے گا۔'' نواب بیگم نے بات کا رُخ بدلا۔

''شاید اس سے بھی زیادہ'' میں نے امید ظاہر کی اور ساتھ ہی انگلی اوپر اٹھا کر کہا۔ ''سب اس کے اختیار میں ہے۔''

سینور نیا ماریا نے کہا۔ ''کے۔ٹو کی چوٹی فتح ہو جانے پر ہم نے آپ کے ملک کی بابت بہت کچھ پڑھا ہے۔ کبھی ہمارے محل میں آ کر ہمیں کچھ اور بتائیے۔''

''جی ضرور۔'' میں نے آنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو میری عین خوش

قسمتی ہے کہ آپ جیسے——"

"اوہو ہو کوئی بات نہیں۔" نواب صاحب نے کہا۔ "یہ تو آپ کی ذرّہ نوازی ہے۔"

اس کے بعد اِدھر اُدھر کی اور باتیں ہوتی رہیں اور پھر میں اگلے ہفتہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا وعدہ کر کے واپس اپنی نشست پر پہنچ گیا۔

"پدر سوختہ۔" فیراکوتی نے حسبِ معمول میرا استقبال کیا۔

باؤسانی نے جدید فارسی میں ایک اور گالی دی جس کا مطلب میں ٹھیک سے سمجھ نہ سکا۔

رات بھر اس شدّت سے ژالہ باری ہوتی رہی کہ میں نے اگلے دن یونیورسٹی جانے کا ارادہ چھوڑ دیا۔ تیسرے سال کے ایک صاحبزادے انہی دنوں منٹو کی کہانی پڑھتے کلمہ لاالہ کا ترجمہ کر رہے تھے۔ انہوں نے خدا جانے کیسے میری نیت بھانپ کر ٹیلی فون کیا کہ اگر یونیورسٹی جانے میں کوئی دقت ہو تو میں موٹر لے کر پہنچ جاؤں۔ آخری چار صفحے رہ گئے ہیں آج سمیٹ لیں گے۔ اس کی لگن سے مجبور ہو کر میں نے ہامی بھر لی اور گیارہ بجے کے قریب چھینٹے اڑاتی موٹر میں سوار ہو کر ہم یونیورسٹی پہنچ گئے۔ کوئی ایک گھنٹہ میں ترجمہ مکمل ہو گیا تو میں نے گھر جانے کے بجائے کلاس روم ہی میں بیٹھ کر اباجان کے نام ایک خط لکھنا شروع کیا کہ کس طرح میری ایک نواب صاحب سے ملاقات ہوئی۔ کیسی کیسی علمی اور ادبی باتیں ہوا کیں اور کس خوشامد سے انہوں نے مجھے اپنے محل آنے کی دعوت دی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ خط خاندان کے ایک ایک کنبہ میں بڑے فخر سے سنایا جائے گا۔ ہمارے سرانے اور خاندان کے دیگر افراد کے درمیان نئے سرے سے فاصلے متعین کیے جائیں گے اور چوبرجی کوارٹر کے کلرک لالا یعقوب کو ہمیں اپنا رشتہ دار تسلیم کرنے سے معذوری ظاہر کرنا پڑے گی۔

مَیں ابھی یہ خط لکھ ہی رہا تھا کہ دروازے پر ہلکے سے دستک ہوئی۔

"آیئے۔" مَیں نے کاغذ سے نگاہیں اٹھائے بغیر کہا اور دروازے کی پھیلتی ہوئی جھری میں سے بھڑ اندر داخل ہوئی۔ اسے اپنے سامنے اس طرح یونیورسٹی کے شعبہ شرقیات میں دیکھ کر میری روح فنا ہو گئی۔ اس نے بڑے شوخ بسنتی رنگ کی برساتی پہن رکھی

تھی۔ اسی رنگ اور اسی کپڑے کی چھوٹے کناروں والی ٹوپی تھی اور ہاتھ میں سیاہ آبنوس کے لمبے دستے والی سلیٹی چھتری تھی۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ "میرے اس طرح یہاں چلے آنے پر تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

میں نے جل کر کہا۔ "ہے کیوں نہیں! ایک تو آپ میری اجازت کے بغیر یہاں تشریف لے آئی ہیں۔ دوسرے آشناؤں کے انداز میں تم کہہ کر مخاطب کر رہی ہیں۔ تشریف لے جایئے۔"

اس نے میز کے قریب پہنچ کر کہا۔ "باہر بلا کی بارش ہو رہی ہے۔ آج آپ موٹر بھی نہیں لائے۔ پاس نہ چھتری ہے نہ برساتی۔ ٹرام تک پہنچتے پہنچتے بالکل بھیگ جائے گا۔"

مَیں نے چڑ کر کہا۔ "آپ کی مہربانی کا شکریہ۔ میں آج شام تک یہیں رہوں گا اور شام تک بارش تھم جائے گی—— آپ تشریف لے جائیں۔"

اس نے چھتری کا ہینڈل ہاتھ میں گھماتے ہوئے کہا۔ "یہ اطالوی بارش ہے۔ شام تو کیا صبح تک نہ تھمے گی۔ میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

"لیکن مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں۔" میں نے چلّا کر کہا۔ "آپ تشریف لے جائیں۔"

بھڑ دبے پاؤں دروازے کے شگاف سے باہر نکل گئی اور میں دو تین منٹ تک الٹی سیدھی باتیں سوچتا رہا۔ پھر خط لکھنے میں مشغول ہو گیا۔ خط لکھ کر میں نے پن بند کیا۔ لفافہ جیب میں ڈالا اور اپنے کمرے کی سیڑھیاں اتر کر نیچے ہال میں چلا گیا۔ باہر دھڑلے کا مینہ برس رہا تھا۔ ڈیوڑھی چھوڑنے سے پہلے میں ایک مرتبہ جھجکا، پھر کوٹ کے کالر اوپر اٹھائے اور برستی دھاروں میں باہر نکل گیا۔ دس قدم کے اندر اندر میرا سر کندھے اور آستینیں ساری بھیگ گئیں اور پھر جیسے ایک دم میرے سر پر بارش نے اپنا نزول بند کر دیا۔ میں نے نگاہ اوپر اٹھائی تو سر سے ایک فٹ اونچا سلیٹی رنگ کا ریشمی ہالا میرے اوپر اوپر چلا آرہا تھا۔ میں نے چور نگاہوں سے پیچھے دیکھا تو اس نے پوچھا۔ "مجھ سے ناراض ہیں؟"

میں نے بھنا کر کہا۔ "یہ کیا حماقت ہے۔ آخر تم مجھے اپنی راہ کیوں نہیں چلنے دیتی ہو۔"

اس نے ہولے سے جواب دیا۔ "آپ اپنی راہ پہ ہی تو جا رہے ہیں۔"

"مگر تم میرے پیچھے کیوں آ رہی ہو؟" میں نے کھنچ کر کہا۔

"اس لیے کہ میری راہ بھی یہی ہے۔"

مَیں خاموش ہو گیا اور جب ہم سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ کے سامنے سے گزرے تو فیرا کوتی برآمدے میں کھڑا اپنی برساتی کی پیٹی باندھ رہا تھا۔ مجھے اس طرح جاتے دیکھ کر اس نے زور کا نعرہ لگایا Bravo پدر سوختہ Bravo اور میں ہاتھ کی جھنڈی ہلاتا مسکراتا آرام سے گزر گیا۔

"مجھ سے ناراض ہیں؟" اس نے پھر پوچھا۔

اور مَیں نے جان چھڑانے کو کہہ دیا۔ "نہیں۔"

"تو پھر میں تمہارا بازو تھام لوں؟"

میں خاموش رہا اور اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔

جس دن مَیں نواب صاحب کے محل جا رہا تھا۔ ایل ویرا میرے کمرے میں میرے سب سے قیمتی سوٹ کو پانی کے تریڑے دے کر بڑے انہماک سے استری کر رہی تھی۔ شیو بناتے بناتے میں نے ایل ویرا کی طرف دیکھا اور ایک آنکھ میچ کر پوچھا۔ "ایل ویرا سوٹ استری کرنے کے بھی دو ہزار لیرے لوگی یا کم؟" اس نے استری سٹینڈ پر رکھ کر میری طرف دیکھا اور پھر پتلون کے بل سیدھے کرنے لگی۔ چولہے کی طرف نظر اٹھا کر اس نے ہولے سے پوچھا۔ "سخت گرم پانی سے منہ دھوؤ گے یا نیم گرم سے؟"

مَیں نے کہا۔ "جیسا بھی مل جائے۔" اور اس نے گیس بند کر دی۔

اس اثنا میں وطن سے اباجان کا جواب آ گیا تھا کہ وہ میرے نئے تعلقات سے بہت خوش ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ اطالیا کے دیگر اعلیٰ خاندانوں اور برتر نسل کے لوگوں سے ابھی میرے روابط اور استوار ہوں گے۔ اباجان نے لکھا تھا کہ بڑے سوچ بچار کے بعد انہوں نے سنت نگر میں میری نسبت توڑ دی تھی کیونکہ اس شادی سے

ہمیں کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ رہا تھا۔ اب وہ ایسے آدمی کی تلاش میں تھے جو حکومت کے کسی بھی بڑے محکمہ میں پرمٹ آفیسر ہو تاکہ اس کی بدولت ہمیں بھی سرکاری فائدہ پہنچ سکے۔

سوا آٹھ بجے لینیسا کے محل میں داخل ہوتے ہی پہلے دربان نے مجھے فرشی سلام کیا۔ اس کے بعد برآمدے کے کلرک نے اندر ٹیلی فون کیا۔ سفید وردی میں ملبوس ایک خدمت گار برآمد ہوا۔ اس نے بڑی منجھی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ گیلری کے آخری کونے پر ایک نوعمر لڑکی نے میری ٹوپی اور کوٹ لیا اور ایک بوڑھی دایہ کے ساتھ مَیں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ نواب بیگم اور ان کی دونوں صاحبزادیاں صوفوں پر نیم دراز تھیں۔ مَیں نے بڑے تپاک سے رسم دست بوسی ادا کی اور بڑی احتیاط سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

کیاریسمّا سنوریناماریا نے پوچھا۔ "آپ کے ملک میں ادبی مجالس بھی ہیں۔"

مَیں نے کہا۔ "جی بے شمار۔"

وہ صوفے پر سنبھل کے بیٹھ گئیں اور پوچھنے لگیں۔ "آپ کے ادب کے کون کون سے مسائل ہیں؟"

مَیں نے عرض کیا۔ "ہمارے ادب کے چند تمدنی مسائل ہیں اور چند جدلیاتی۔"

میرے اس جواب سے وہ بہت متاثر ہوئیں اور کیاریسمّا آنا کی طرف دیکھ کر بولیں۔ "ادب کے اظہار سے متعلق آپ کے ادیبوں نے کس قسم کے تجربے کیے ہیں؟"

میں ٹپٹا گیا اور گلا صاف کر کے بولا۔ "ہمارا ادب صوتی اعتبار سے دنیا کا ایک ہی ادب ہے۔ ہماری زبان میں کوئی بھی لفظ ایسا نہیں جو صوتی اعتبار سے اسم کی ترجمانی نہ کرتا ہو۔ مثلاً ہاتھی لیجیے۔ تھ پکارنے کے لیے جب زبان کی نوک اوپر کے تالو سے لگتی ہے تو ایک قسم کی گھمبیرتا ایک قسم کی ہیبت اور ایک طرح کے خوف کا احساس ہوتا ہے۔ دیکھیے ہاتھی! ایلی فانتے میں وہ بات نہیں ہے۔"

نواب بیگم نے پوچھا۔ "گینڈے کو آپ کیا کہتے ہیں؟"

میں نے قدرے لرز کر کہا۔ "تھالی!—— دیکھئے تھ پہلے آجانے کی وجہ سے اس میں اور بھی کرختگی پیدا ہو گئی ہے۔"

آنا نے مرعوب ہو کر پوچھا۔ "چیونٹی کو آپ کی زبان میں کیا کہتے ہیں؟"

"کیڑی۔" میں نے ہونٹ ہلائے بغیر جواب دیا۔

اور تینوں یک زبان ہو کر بولیں۔ "کیری۔"

"اب دیکھئے۔" میں نے ماہر لسانیات کی طرح کہا۔ "یہ لفظ آدمی کے منہ سے یوں نکل جاتا ہے جیسے مداری کے منہ سے جادو کا فیتہ۔ اس میں ایک طرح کا چھوٹا پن ایک طرح کی کمزوری اور ایک انداز کی مفعولیت پنہاں ہے۔"

وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر کیری کیری کرنے لگیں۔ نواب بیگم نے پوچھا۔ "پروفیسورے آپ کو یورپی گانے والوں میں سے کون سب سے زیادہ پسند ہے؟"

مجھے ایک پال رابسن کا نام یاد تھا مگر وہ کمبخت کالا حبشی تھا اور اس کا نام اس محفل میں لیا جانا میری اور اس خاندان دونوں کی بے عزّتی تھی۔ میں نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "بنیامینو جیلی اور——اور——"

"بس بس۔" آنا نے خوش ہو کر کہا۔ "دیکھا امی غیر ملکی بھی اسی کو پسند کرتے ہیں۔"

سینورینا ماریا نے اوپرا کی پریمادونا کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہا تو میں نے عرض کیا۔ "اس سلسلے میں تو یونان کی گانے والیاں سب سے اوّل ہیں۔" صلاح یہ ٹھہری کہ اگلے ہفتہ اوپرا جانا چاہیے۔ میں سلام کر کے ٹوپی اور اوور کوٹ لے کر گھر واپس آ گیا۔

اپنے کمرے کے کونے میں سر نیہوڑائے میں ریڈیو سکرپٹ لکھ رہا ہوں۔ ایل ویرا دیوان پر بیٹھی پرانی جرابیں رفو کر رہی ہے کہ اچانک اس نے سوئی روک کر پوچھا۔

"ایشے فک دنیا گول ہے ناں؟"

"ہوں۔" میں نے ویسے ہی لکھتے لکھتے جواب دیا۔

"تو پھر جو لوگ نیچے رہتے ہیں، وہ گر کیوں نہیں جاتے؟"

میں نے چڑ کر کہا۔ "تم کوئی دو ہزار لیرے کی بات کرو۔ کوئی تھانے تحصیل کی دھمکی دو، یہ باتیں تمہارے سمجھنے کی نہیں۔"

وہ خاموشی سے پھر رفو کرنے لگی۔ ایل ویرا کی موجودگی کا ایک فائدہ بھی تھا اور وہ یہ کہ جب کبھی مجھے کسی لفظ کے معنی نہ آتے تو اس سے پوچھ لیتا۔ معنی بتا کر وہ اس قدر خوش ہوتی جیسے ہفت اقلیم کی بادشاہت مل گئی ہو لیکن میری اور اس کی یہ ملاقاتیں بس میرے کمرے تک ہی محدود تھیں۔ باہر اس کے ساتھ نکلنا میں گوارا نہ کرتا تھا اور کبھی سرِ راہے اچانک ملاقات ہو جانے پر وہ خود کنی کاٹ جایا کرتی تھی۔ اس کی ایک تمنا سے میں بخوبی واقف تھا اور وہ یہ کہ کسی دن ہم اکٹھے تھیٹر یا سینما چلیں مگر ایک طوائف کے ساتھ کھلے بندوں یوں گھومنا کسی شریف آدمی کو کب پسند آتا ہے بھلا۔ میں نے صاف لفظوں میں اس سے کہہ دیا کہ اس کی تمنّا نہ رکھے اور کوئی اور گھر تلاش کرے۔

ایک مرتبہ میلان کا مشہور سرکس "چرِکو تونی" روما آیا تو اس نے تجویز پیش کی کہ ہم اچھے خاصے طویل وقفے کے بعد گھر سے چلیں اور ایک دوسرے کے پیچھے سرکس پہنچ جائیں۔ باکس پہلے سے مخصوص کروالیں گے اور کوئی ہمیں دیکھنے والا نہ ہوگا مگر میں نے اس کی یہ تجویز بھی رد کر دی اور سرکس ایک مہینہ بعد واپس چلا گیا!

اماں کا خط آیا کہ تمہارے ابا نے ایک پرمٹ آفیسر ڈھونڈا تھا۔ میں لڑکی بھی جا کر دیکھ آئی تھی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ افسر ایک سال کے اندر اندر ریٹائر ہونے والا ہے۔ اس لیے ارادہ ترک کر دیا مگر تلاش جاری ہے۔

محل کے اندر اور باہر کیاریسمّا سینورینا ماریا سے میری ملاقاتیں بہت بڑھ گئی تھیں اور اب مجھے ماریا کے سوا اور کچھ دکھائی ہی نہ دیتا تھا۔ اپنی حیثیت سے بڑھ کر اگر کوئی تحفہ خریدتا بھی تو ایل ویرا ہی اس کا پارسل بناتی اور وہی اسے ڈاک خانے لے جا کر سپردِ ڈاک بھی کرتی۔ ایل ویرا ہی سے میں نے ایک رومال پر چائے رنگی پتیوں کا پھول کڑھوا کر ماریا کو دیا تھا کہ یہ ہمارے ملک کی صنعت کا ایک نادر نمونہ ہے۔ کچھ پیسے ایل ویرا سے لے کر اور کچھ اپنی جیب سے ڈال کر میں نے پرانی اشیاء فروخت کرنے والے سے تانبہ کی کئی صد سالہ ایک چھوٹی سی ڈبیا خریدی تھی اور اسے ماریا کی خدمت میں یہ

کہہ کر گزارا تھا کہ موہنجوداڑو کی کھدائی سے نکلی تھی اور ہمارے خاندان میں اس وقت سے چلی آ رہی تھی۔ جب میرے اَب وجد سندھ کے حاکم تھے۔ ڈبیا خریدنے کے لیے ایل ویرا نے اتنی بڑی رقم مجھے اس شرط پر دی تھی کہ ایک دن ہم اکٹھے پک نِک پر چلیں گے۔

وقت مقررہ پہنچنے پر گو میرا سارا وجود کانپنے لگا تھا، تاہم میں وعدے سے انحراف نہ کر سکا۔ جب روما کی سرحد ختم ہو گئی اور دوئے پونتی گاؤں کی حدوں میں داخل ہونے لگے تو میں نے بریک لگا دی اور ایل ویرا سے کہا۔ ”ہم آگے نہیں جائیں گے۔“

”کیوں آخر؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

”اس لیے کہ روما کی حد یہاں ختم ہو جاتی ہے اور آگے دوئے پونتی کا نیا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔“

ایل ویرا کانوں تک سرخ ہو گئی اور شرما کر اس نے سر جھکا لیا۔ مَیں نے موٹر سٹارٹ کر کے روما کی طرف موڑنا چاہی تو اس نے سٹیئرنگ پکڑ کر دوئے پونتی کی طرف کاٹنا شروع کر دیا۔

میں نے زور سے اس کی کلائی پر ہاتھ مارا تو اب کے اس کا سکّہ گھوم کر میری پشت دست پہ نہ لگا کیونکہ اب اس کی کلائی میں وہ زنجیر ہی نہ تھی۔ دوئے پونتی سے ذرا آگے نکل کر ہم نے ایک سرسبز ٹیلے کے پہلو میں موٹر روک لی۔ کھانے پینے کی چیزیں نکالیں اور عین چوٹی پر جا کر بیٹھ گئے۔ نیچے سے گاڑی گزرتی تھی اور پرے ایک برساتی نالہ بل کھا رہا تھا۔ شہر سے دور یہاں پہنچ کر جہاں مجھے کوئی نہیں جانتا تھا، مَیں ایک بار پھر ایل ویرا سے بیگانوں کی سی باتیں کرنے لگا۔ اس نے میرے کوٹ کی آستین پر چکنائی کے داغ کو ناخن سے کھرچتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہیں ماریا سے بہت زیادہ محبت ہے!“

مَیں نے کہا۔ ”بس اسی قدر کہ گزشتہ زمانوں سے لے کر اب تک کی ساری محبتیں یکجا ہو جائیں تو ہماری محبت کا ایک پہلو واضح ہو۔“

”تم اس سے شادی کرو گے؟“ ایل ویرا نے پوچھا۔

”خواہ میری راہ میں تانبے کے تپتے ہوئے پہاڑ اور شعلوں کی ندیاں آ جائیں تو بھی۔“

اس نے کہا۔ ”پھر تمہیں مہمانوں کے کوٹ اور ٹوپیاں پکڑنے کو ایک لڑکی کی تو ضرورت ہو گی؟“

مَیں نے کہا ”کیوں نہیں۔“ اور ساتھ ہی اس کی ناک پکڑ کر کہا۔ ”تم طوائف لوگ بھی بڑی ذہین ہوتی ہو۔“

اس نے فوراً میری آستین چھوڑ دی۔

گاؤں کے کچھ بچے ہماری موٹر کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے تھے اور شیشوں میں سے اندر جھانک رہے تھے۔ میں نے سیٹی بجا کر انہیں اوپر پہاڑی پر بلایا۔ کچھ میٹھی گولیاں اور ٹافیاں ان کی نذر کیں اور باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں بچے ہم سے مانوس ہو گئے اور مَیں نے اپنے مفلر کو بل دے کر انہیں کوٹلہ چھپاکی کا کھیل سکھانا شروع کیا۔ سب ایک دائرہ باندھ کر بیٹھ گئے اور میں کوٹ کے نیچے کوٹلہ چھپا کے ان کے گرد چکر لگانے لگا۔ کوٹلہ ایل ویرا کے پیچھے پھینک کر مَیں نے جلدی سے اپنا چکر ختم کیا اور پھر دھڑا دھڑ اس کی کمر پر کوڑوں کی بارش کر دی۔ وہ اوئی کر کے اٹھی، پھر زور سے ہنسی اور ہڑبڑا کر شور مچاتی بھاگنے لگی۔ سب بچے تالیاں پیٹنے لگے اور ہم ہنس ہنس کے بے حال ہو گئے—— اس کے بعد شہسواروں کی لڑائیاں شروع ہوئیں۔ ماریو ایل ویرا کے کندھوں پر چڑھا اور جینا میری گردن پر سوار ہوئی۔ ماریو جب بھی زور کا وار کرتا، جینا میرے بال پکڑ لیتی۔ دو تین واروں سے میری آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ جینا شور مچا رہی تھی۔ گھوڑے شاباش گھوڑے شاباش، ایل ویرا نعرے مار رہی تھی۔ شاباش سوار زندہ باد سوار۔ مَیں نے اپنی زد پٹتی دیکھی تو کندا مار کر ایل ویرا کو گرا دیا۔ میدان ہمارے ہاتھ رہا۔ وی واسینور پاکستانو وی واسینور پاکستانو کے نعروں سے رن کانپنے لگا۔

اگلے دن مجھے بڑے بھائی کا خط ملا کہ ملک کے دو بڑے حصے بنا دینے کا فیصلہ کیا جا رہا ہے، جلدی پہنچنے کی کوشش کرو۔ تمہیں ایک اچھی سی نوکری ملنے کی امید ہے۔ ہم نے مولوی غلام رسول کی معرفت سعادت یار خاں کے ہاں رشتہ کا پیغام بھجوا دیا ہے۔ اس طرح لاہور میں مستقل ہو جانے کی قوی امید ہے۔ جلد آنے کی کوشش کرو۔

میں جلد آنے کی کوشش تو اس وقت کرتا جب ماریا میری محبت کا جواب

سرد مہری سے دیتی۔ وہ میرے تبحرِ علمی پر مٹی ہوئی تھی اور مَیں پاکٹ انسائیکلوپیڈیا لمحہ بھر کو اپنے پہلو سے جدا نہ کرتا تھا۔ کیا ریسّما آنا کو ہماری محبت کا علم ہو چکا تھا اور وہ خدا جانے کیوں جل بجھی جاتی تھی۔ انہی دنوں روم یونیورسٹی کے ساتھ میرا معاہدہ ختم ہو رہا تھا اور میں نئے معاہدے کی فکر میں تھا مگر بات بنتی نظر نہ آتی تھی۔ ایل ویرا مغموم رہنے لگی تھی کیونکہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے معاہدہ کی اب تجدید نہ ہو گی۔ ماریا پریشان تھی کیونکہ آنا نے سوا اپے لینسا بارونیسا کو بتا دیا تھا کہ مَیں دراصل کیتھولک نہیں ہوں۔ نواب صاحب قبلہ اور نواب بیگم صاحبہ کچھ اس خلوص کے ساتھ میرا سواگت نہ کرتے تھے۔ اب نہ دروازے پر کوئی مجھے لینے آتا نہ چھوڑتے ہوئے فرشی سلام کرتا۔ لے دے کے ایک ماریا کی محبت تھی جو دامنِ دل کھینچ رہی تھی۔ میرے گھر میں ایل ویرا کے بڑھتے ہوئے اوقات مجھے اور پریشان کر رہے تھے اور مجھے اس یگانگت اور آشنائی سے سخت نفرت ہو رہی تھی۔ کاجل کی کوٹھڑی میں دھبہ کا دھڑکا ہر وقت لگا رہتا۔

جس دن یونیورسٹی کی طرف سے ایک بڑے سے لفافے میں مجھے جہاز کا ٹکٹ اور میری خدمات کے جواب میں شکریہ کی ایک طویل چٹھی موصول ہوئی، میرے پاؤں کی زمین نکل گئی۔ مَیں نے ٹیلی فون پر ماریا کو یہ دلدوز خبر سنائی تو اس نے شاید آنسو ضبط کر کے کہا۔ "یہ دوریاں یہ فاصلے ہماری محبت کی راہ میں بال برابر بھی اہمیت نہیں رکھتے۔ تم فکر نہ کرو مَیں یہ رشتہ و پیوند توڑ کر حسین اطالیہ سے منہ موڑ کر اگلے ہی جہاز میں تمہارے پاس پہنچتی ہوں۔" ٹیلی فون پر میری آواز بھرا گئی تو اس نے چمکار کر کہا۔ "اُف خدایا، مشرقی لوگ کیسے یاس پسند ہوتے ہیں۔ کبھی تو مصیبت کا ہماری طرح مردانہ وار مقابلہ کیا کرو۔" مگر اس کی باتوں سے میرے آنسو ضبط نہ ہو سکے۔

ایل ویرا کو کتابیں ٹھیک کرتے سامان باندھتے ہوئے دیکھتا تو اتنی تسلی ضرور ہوتی کہ اب اس لعنت سے تو نجات ملے گی۔

دربان کو پتہ چل گیا تھا۔ مینشن کے لوگوں میں باتیں ہونے لگی تھیں۔ کچھ ایسی ویسی خبریں یونیورسٹی میں بھی اڑنے لگی تھیں۔ خدا کا شکر ہے ان سے تو نجات ملے گی۔ ان آخری ایّام میں ایل ویرا نے بات کرنا بالکل ترک کر دیا تھا۔ اکثر کتابوں پر مومی

کاغذ چڑھاتے چڑھاتے وہ تھک کر وہیں دیوان پر سو جاتی۔ جب میں آدھی رات کے بعد ماریا کے ہاں سے لوٹتا تو اسے جھنجھوڑ کر جگاتا اور شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف انگلی سے اشارہ کرتا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے جوتا پہنتی، چھتری اٹھاتی اور نیم خوابی کے عالم میں باہر نکل جاتی۔

میرے روما چھوڑنے کا دن آ پہنچا۔ ایل ویرا نے کہا مجھے اپنے ساتھ نیپلز تک چلنے کی اجازت دو مگر مَیں نہ مانا کیونکہ ماریا اور آنا مجھے نیپلز کے ساحل پر الوداع کہنے آ رہی تھیں۔ نواب صاحب نے تو کہا تھا کہ روما کے سٹیشن پر ہی الوداع کہہ دی جائے مگر نواب بیگم نہ مانیں کہ روما کے سٹیشن پر پروفیسوئے کے دوست، یونیورسٹی کے چپراسی دفتری اور محلّہ کے لوگ وغیرہ الوداع کہنے آئیں گے اور وہاں ایسی بے ہنگم بھیڑ میں ہم شرفاء کا جانا ٹھیک نہیں۔ مَیں نے بھی اس کی تائید کی اور یہی مناسب سمجھا کہ نیپلز ہی ٹھیک ہے کیونکہ تخلیہ میں مستقبل کے پروگرام تو بن سکیں گے۔ گیارہ تاریخ کو رات کے دس بجے میرا جہاز روانہ ہو رہا تھا اور میں اسی دن صبح کے نو بجے روما سے نیپلز جا رہا تھا تاکہ دن بھر کسٹم وغیرہ کے ضوابط سے فارغ ہو کر ہورف پر ماریا اور آنا کا انتظار کر سکوں۔ جو شام کے پانچ بجے اپنی کار میں نیپلز پہنچ رہی تھیں۔

صبح اپنے گھر سے روانہ ہوتے وقت میں نے رسمی طور پر ایل ویرا کو گلے لگا لیا۔ اس نے دونوں بازو میری کمر میں حمائل کر دیئے اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔ "مجھے خط تو لکھا کرو گی نا؟" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اس کی کہنیاں پکڑ کر بازو علیحدہ کیے اور سٹیشن پر آ گیا۔ ٹکٹ لینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو مڑے تڑے ہزار ہزار لیرے کے دو نوٹ میری جیب میں پڑے تھے۔ مجھے ایل ویرا کی حماقت پر ہنسی آ گئی۔

روما اور نیپلز کی شاہراہ پر آئے دن حادثات ہوتے ہیں اور نواب صاحب کا ڈرائیور ساٹھ ستّر سے کم رفتار پر موٹر نہیں چلاتا۔ رات کے نو بج چکے تھے اور ماریا اور آنا کا پتہ نہ چلتا تھا۔ میں گینگ وے کے پاس کھڑا پریشان نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور مسافر افراتفری کے عالم میں مجھے دھکے پہ دھکا دیئے جا رہے تھے۔ اس دن یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وطن چھوٹ رہا ہو اور جہاز کسی نامعلوم مقام کی طرف لنگر اٹھانے

والا ہو۔ گینگ وے اٹھنے سے ذرا پہلے بارش شروع ہو گئی اور ہم سب مسافر جلدی جلدی عرشہ پر پہنچ گئے۔

ایک گز! دو گز!۔۔۔ تین گز!

جہاز نیپلز کے گھاٹ سے آہستہ آہستہ دور ہونے لگا۔ نیچے شیڈ میں مَیں نے ماریًا کی کار کا ہارن سنا۔ مجھے یقین ہے وہ ماریًا ہی کی کار تھی مگر اب جہاز دھیرے دھیرے رُخ بدل رہا تھا۔

بارش کی بوندیوں کے پیچھے بندرگاہ کی روشنیاں آنسو بن کر گلتی جا رہی تھیں۔

سامنے کرین کی اوٹ میں سے ایک سایہ آگے بڑھا اور ان بوندیوں کے درمیان ایستادہ ہو گیا۔ شوخ بسنتی رنگ کی برساتی۔ اسی رنگ اور کپڑے کے چھوٹے کناروں والی ٹوپی اور ہاتھ میں سیاہ آبنوش کے لمبے دستہ والی سلیٹی چھتری۔

پیچھے ہٹ کر میں نے اپنے کوٹ کی بھیگی ہوئی آستین کو دیکھا اس میں سے فینائل فلالین اور پٹرول کی بو آ رہی تھی۔

☆------------

اشفاق احمد کی کتابیں

- ایک محبت سو افسانے
- وداع جنگ
- پھلکاری
- صبحانے فسانے
- توتا کہانی
- اور ڈرامے
- ننگے پاؤں
- حیرت کدہ
- شاہلا کوٹ
- من چلے کا سودا
- بابا صاحبا
- سفر در سفر
- ٹاہلی تھلے
- جنگ بجنگ
- حسرت تعمیر

Rs. 200.00

www.sang-e-meel.com

ISBN 969-35-1249-9

